سبط حسن

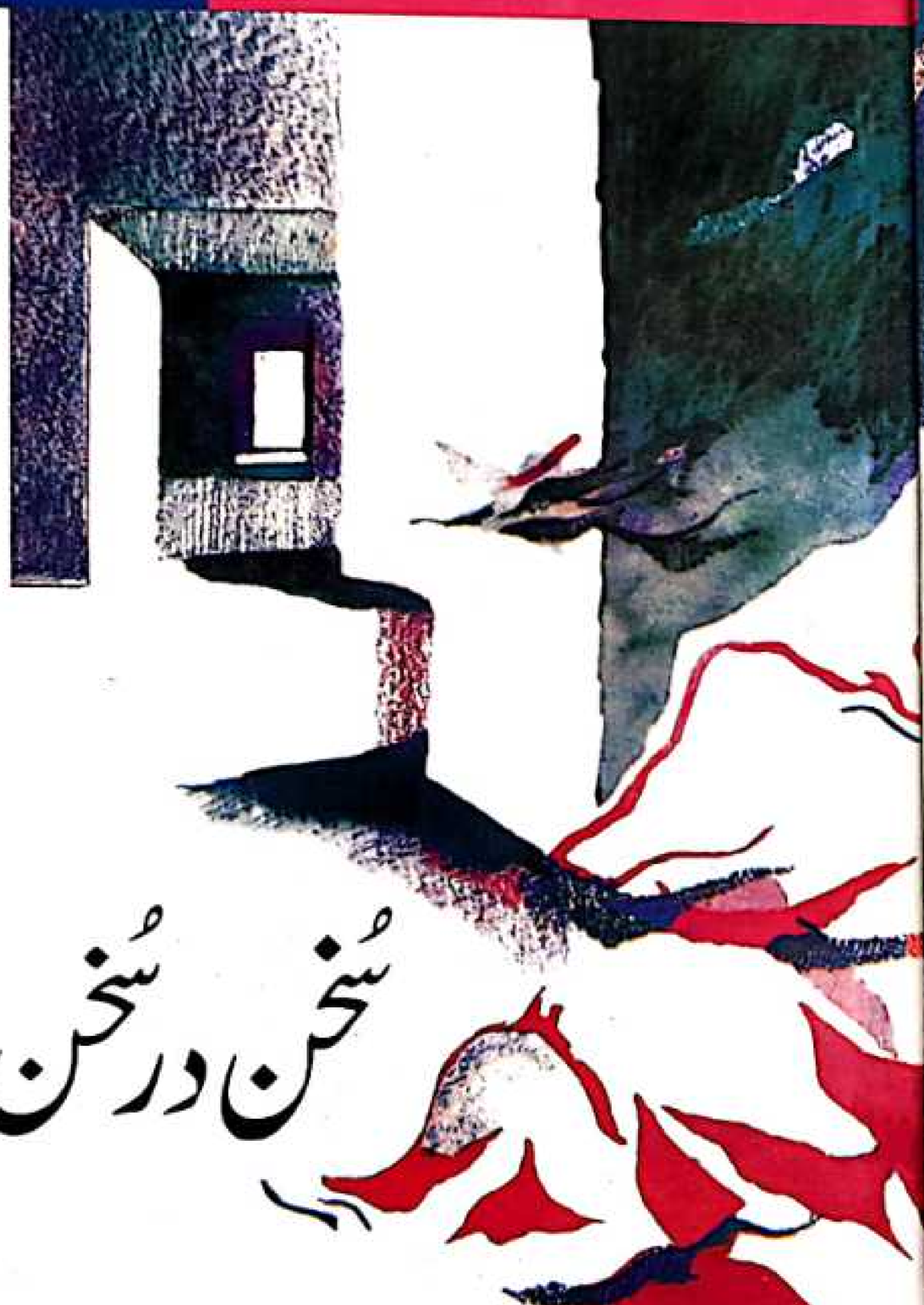

سُخن در سُخن

سخن در سخن

سبطِ حسن

دانیال

فیض احمد فیض اور سیّد سبطِ حسن کی رفاقت کا زمانہ چالیس سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ ہر دو معاصرین میں سیاسی اور فکری یگانگت مثالی تھی، سُخن در سُخن اس دعوے کا روشن ثبوت ہے۔ فیض صاحب کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے اور جن واقعات و حادثات نے ان کے قلب و ذہن پر گہرا اثر ڈالا، ان کا اثر سبطے صاحب کے افکار و جذبات پر بھی نمایاں ہے، چنانچہ فیض صاحب کی شاعری کے سیاسی پس منظر کو بیان کرنے کے لئے سبطے صاحب سے زیادہ معتبر کوئی اور شخص نہیں ہوسکتا۔ سبطے صاحب نے اس کام کو اپنے لیے ایک اہم فریضہ سمجھا اور اس پر زندگی کے آخری دِنوں تک کام کرتے رہے۔ ادب کی تفہیم اور ادبی شعور کی بیداری میں فیض صاحب کی شاعری نے جو کردار ادا کیا ہے، سبطِ حسن نے وہی کام اپنی سادہ اور بلیغ نثر کے ذریعے انجام دیا ہے۔

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : حوری نورانی
مکتبہ دانیال، سنو وہائٹ سینٹر،
عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی
مطبع : ذکی سنز پرنٹرز، کراچی
کمپوزنگ : احمد گرافکس، کراچی
سرورق : سلیمہ ہاشمی
اشاعت : دوسری بار ۲۰۰۹ء
قیمت : ۱۷۵ روپے

Maktaba-e-Danyal: Snowhite Centre
Opposite Jabees Hotel
Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone: 5681457-5682036
e-mail:danyalbooks@hotmail.com

سُخن دَر سُخن

سبطِ حسن

دانیال

تعارف

فیض چچا کے انتقال پر اس کتاب کو لکھنے کا خیال ابّو کے ذہن میں آیا تھا۔ انہیں گئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ ابّو بھی چل دیئے۔ یہ راز اُن کے جانے کے بعد کُھلا کہ وہ فیض پر جو کچھ لکھنا چاہتے تھے وہ لکھ چکے تھے۔

فیض کے جانے کے بعد ابّو اکثر یہ کہتے تھے کہ 'میرے پاس کام بہت ہے اور وقت کم' مگر شاید انہیں خود بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ عرصہ اس قدر مختصر ہوگا۔

ابّو بیک وقت تین چار کتابوں پر کام کرتے تھے۔ آخری دنوں کی کتابوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اکثر جب میں شام کو اُن کے ساتھ چائے پینے جاتی تو اُن کو فیض کے اشعار گنگناتے ہوئے پاتی پھر اُن کی میز پر آمنہ باجی کا دیا ہوا 'نسخہ ہائے وفا' کی جلد بھی نظر آنے لگی۔ ہم دِل ہی دِل میں خوش ہوئے کہ کتاب پر کام ہو رہا ہے اور اس کام کے لیے ابّو سے بہتر کون ہوسکتا تھا۔ دونوں نے زندگی کے کئی دور ایک ساتھ گزارے تھے۔ ساتھ ہی دار و رسن کی صعوبتیں سہی تھیں اور زنجیروں کی جھنکار پر پابہ جولاں چلے تھے۔ انسانیت کے لیے سنہرے خواب بھی انہوں نے ساتھ ہی تو دیکھے تھے قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ دونوں نے زندگی کا سفر بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہی تمام کیا۔

گو ہمیں اندازہ تھا کہ وہ فیض پر کام کر رہے تھے لیکن وہ کس حد تک مکمل تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اُن کے انتقال کے بعد ذرا سی تلاش سے مسودہ

ہاتھ آ گیا کیوں کہ ابّو عادتاً بہت منظم انسان تھے۔

ابّو ان حسابوں بہت خوش قسمت تھے کہ انہیں ہمیشہ بہت پُر خلوص لوگ ملے۔ ابّو اور حسن عابدی صاحب کا ساتھ تو میرے نزدیک ہمیشہ کا ہی تھا۔ جس طرح خاموشی سے عابدی صاحب ابّو کی زندگی میں آتے، آہستہ آہستہ گفتگو کرتے اور پھر اتنی ہی خاموشی سے چلے جاتے اب بھی ان کی اس روایت میں بالکل فرق نہیں آیا۔ شروع سے آخر تک اس کتاب کے سارے کام عابدی صاحب نے ہی انجام دیئے ہیں۔ مسودے پر نظرِ ثانی کرنا، حوالے مکمل کرنا اور کتاب کو مکتبہ دانیال تک پہنچانا، تمام پروف کو پڑھنا اور آخر میں کتاب کا نام بھی تجویز کرنا یہ سب عابدی صاحب نے ہی کیا۔

ان کا شکریہ ادا کرنا تو نہ صرف چھوٹا منہ بڑی بات بلکہ سراسر بدتمیزی ہوگی مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر عابدی صاحب کراچی میں نہ ہوتے تو شاید یہ کتاب اب تک آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی۔

مکتبۂ دانیال کے ملک نورانی صاحب کی علالت کے باعث ان کی بیٹی حوری نے اپنے والد کی جیسی محنت اور لگن سے اس کتاب کو ہر منزل تک پہنچایا جس طرح ملک چچا کرتے۔

سلیمہ نے اپنے والد اور چاہنے والے چچا کی خدمت میں محبت کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے یہ خوبصورت سرورق لاہور سے بنا کر بھیجا اور اس طرح ابّو کے انتقال کے ایک برس بعد یہ کتاب آپ تک آئی ہے۔

نوشابہ زبیری

تمہید

ایک مختصر عبارت اس کتاب کے لیے تعارف کے طور پر لکھی تھی۔ اس کا مسودہ کتابت شدہ میری غفلت سے کہیں کھو گیا۔ دوبارہ لکھنے کی ہمت کی لیکن اس دوران میں نوشابہ زبیری صاحبہ کی تحریر نظر سے گزری۔ اب مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ میرے بارے میں جو توصیفی کلمات اس عبارت میں آتے ہیں، انہیں پڑھتے وقت حذف کر دیجیے۔ البتہ ان پر میرا شکریہ واجب ہے کہ مجھے سبطِ صاحب کے نیاز مندوں میں شمار کیا اور اعتماد کے قابل جانا۔

سبطِ صاحب کی کتاب کا مسودہ پڑھتے وقت مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان کا سوادِ خط جلی، پاکیزہ اور پختہ بالکل ان کی مزاج کی طرح تھا۔ البتہ ان کا ایک خاص انداز تھا کہ جب کسی مقام پر اپنی عبارت سے نامطمئن ہوتے تو اسے قلم زد کیے بغیر وہی بات ترمیم و اضافے کے ساتھ از سرِ نو لکھنی شروع کر دیتے، اس طرح یہ فیصلہ کرنے میں مجھے ابتداً قدرے دشواری ہوئی کہ اصل عبارت کون سی ہے اور کسے قلم زد کیا جانا چاہیے۔ تاہم مسودے کو دوسری بار پڑھنے کے بعد یہ مرحلہ مشکل نہ رہا۔

فیضؔ صاحب پر ابھی بہت کم لکھا گیا ہے، آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ فیضؔ کے شارحین اور ان کے ناقدوں کے لیے یہ کتاب بنیادی نوعیت کی دستاویز ثابت ہوگی۔ فیضؔ کے کلام کے پس منظر کی وضاحت سبطِ صاحب سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا تھا۔ سو اپنی زندگی کے آخری دنوں تک انہوں نے یہ کام انجام کو پہنچا دیا۔

حسن عابدی

دوسری جنگ عظیم ابھی چھڑی نہیں تھی کہ ہٹلر کی فوجیں آسٹریلیا اور چیکوسلاواکیہ پر قبضہ کر چکی تھیں اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ یہ سیلاب بلا فوجی مقاومت کے بغیر رکنے والا نہیں۔ ہم لوگ ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ جوانی دیوانی کے دن تھے۔ ایک شام مجاز، سردار جعفری اور راقم لکھنؤ کی سیر کو نکلے اور ٹہلتے ٹہلتے دانش کدے پہنچ گئے۔ امین آباد میں کتابوں کی یہ دکان ادیبوں کی بیٹھک بھی تھی جہاں احتشام حسین، پنڈت آنند، نرائن ملا، علی جواد زیدی، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری غرضیکہ شہر کے اکثر ادیبوں سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ اُس وقت اتفاق سے ان میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ ہم لوگوں نے کتابوں پر نظر ڈالی تو فیض احمد فیض کی 'نقش فریادی' اور ن۔ م۔ راشد کی 'ماورا' دکھائی دی۔ ان شاعروں کی بعض نظمیں ادبی رسالوں میں پڑھی تھیں اور اچھی لگتی تھیں لہٰذا شوق کے ہاتھوں جیب خالی کی گئی اور طے پایا کہ فرنگی محل چلا جائے جہاں حیات اللہ انصاری رہتے تھے اور ان کتابوں کو اطمینان سے بیٹھ کر پڑھا جائے۔ حیات اللہ انصاری جتنی اچھی کہانیاں لکھتے تھے اتنی ہی اچھی چائے بناتے تھے البتہ اُن کا سخن فہمی کا خانہ بالکل خالی تھا، یہاں تک کہ وہ شعر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے۔ شعر میں ایک لفظ گھٹائے بڑھائے بغیر اُن کو چین نہیں آتا تھا۔ خیر چائے کا دَور چلا اور شعر خوانی شروع ہوگئی۔ جب ایک شخص تھک جاتا تو دوسرا پڑھنے لگتا۔ نقشِ فریادی میں نظموں، غزلوں کے نیچے سنِ تصنیف درج نہ تھا پھر بھی شاعر کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں ہجر و فراق کے مضامین روایتی تھے البتہ پڑھتے پڑھتے جب ہم لوگ اُس مقام پر پہنچے جہاں شاعر آرزوؤں کے سوجانے اور کہانیوں کے کھوجانے کا ماتم کرتے ہوئے کہتا

ہے کہ ۔

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہوگئی ہیں میرے ندیم !

تو فیض صاحب کے نئے پیرایۂ اظہار اور اچھوتے اندازِ احساس نے ہم لوگوں کو چونکا دیا۔ اس نظم کے بعد اُن کی شاعری میں جو تبدیلی آئی اُس کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'۱۹۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں، میں نے ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں ملازمت کرلی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کرکے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں بہرحال گردوپیش کے بھی تجربات شامل ہیں۔۔۔ اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سودمند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا 'نقشِ فریادی' کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔

اس نظم کا عنوان ہے 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' اور اگر آپ خاتون ہیں تو 'مرے محبوب نہ مانگ'۔

ترقی پسند ادب کی تحریک انسانی تاریخ کے انتہائی پُرآشوب دور میں شروع ہوئی تھی۔ عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے دنیا شدید اقتصادی بحران میں مبتلا تھی۔ اس بحران کے باعث ہندوستان کی نوآبادیاتی معیشت کی حالت خاص طور پر زیادہ زبوں تھی چنانچہ فیض صاحب کے بقول 'کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مارخان تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی بہو بیٹیاں بازار میں آبیٹھیں'۔ ملک کا یہ حال تھا اور یورپ میں فاشزم کا عفریت آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی میں برسرِ اقتدار آتے ہی جمہوریت پسند سیاست دانوں اور روشن خیال ادیبوں، مفکروں اور موسیقاروں اور سائنس دانوں سب پر عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا۔ جو دار و رسن سے بچے اُن کو بھاگ کر سوویت روس اور امریکہ میں پناہ لینی پڑی۔ ارنسٹ ٹولر، سٹیفان زوائگ، تھامس مان اور ہنرائک مان، فرائڈ اور آئن اسٹائن سب ملک بدر ہوئے۔ اسی اثنا میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کردیا۔ اس جارحانہ اقدام پر مجلسِ اقوام میں بہت شور مچا لیکن مسولینی کو برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کی پشت پناہی حاصل تھی لہٰذا مشرق کے ایک پس ماندہ ملک کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا اور مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کرلیا۔

ان حالات نے دنیا بھر کے روشن خیال ادیبوں کو سوچنے پر مجبور کردیا کہ آزادی اور جمہوریت کے دشمنوں کا اگر جم کر مقابلہ نہ کیا گیا تو پرورشِ لوح و قلم کے امکانات ہی باقی نہ رہیں گے۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس، امریکہ ہر جگہ ادیبوں کی تنظیمیں بننے لگیں اور ادیبوں میں اپنی سماجی ذمے داریوں کا احساس تیزی سے بڑھنے لگا۔ ہندوستان میں ترقی

پسند ادیبوں کی تنظیم قائم کرنے کا منصوبہ ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، سید سجاد ظہیر اور صاحبزادہ محمود الظفر وغیرہ نے لندن میں بنایا تھا البتہ اس منصوبے نے عملی شکل ۱۹۳۶ء میں اس وقت اختیار کی جب سجاد ظہیر نے وطن واپس آکر ملک کے بیشتر ممتاز ادیبوں سے ملاقات کر کے اُن کی تائید حاصل کرلی۔ وہ لاہور میں نوجوان ادیبوں کے علاوہ علامہ اقبال، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور مولانا غلام رسول مہر سے بھی ملے۔ لکھنؤ میں علامہ نیاز فتح پوری نے اُن کی حوصلہ افزائی کی اور منشی پریم چند نے نہ صرف تائید کی بلکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی (جو لکھنؤ میں ہوئی تھی) صدارت بھی کی۔ منشی جی نے اپنے خطبے میں انجمن کے اغراض ومقاصد بڑی تفصیل سے بیان کیے اور فرمایا کہ ہم کو ایسا ادب درکار ہے جو لوگوں کو جگائے نہ کہ سُلائے۔

فیض صاحب اُن دنوں ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ انجمن سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'شباب کا دَور تھا اور مرضِ عشق بھی لاحق تھا۔ رشید جہاں نے کہا چھوڑو یہ عاشقی کے چکّر وغیرہ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دُنیا کے دُکھ جو ہیں اُن کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمہارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے اور اُنہوں نے ہم کو سکھایا کہ اپنا غم جو ہے تو یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دُکھ دیکھو اور اپنے لوگوں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے۔ اُن کی پتا کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ اپنے ہی لیے سوچتے رہوگے۔ یہ تو خود غرضی ٹھہری، ہمارا یہ شعر اُسی زمانے کی یادگار ہے کہ ؎

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سِوا،
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سِوا'

فیض صاحب کی سمجھ میں یہ بات تو آگئی کہ محبت کے سِوا دنیا میں اور بھی دُکھ ہیں

لیکن خوباں سے رہ و رسمِ آشنائی انہوں نے کبھی ترک نہیں کی۔ وہ تمام عمر 'لیلاؤں کی خیر' مناتے رہے اور ہجر و فراق کی گھڑیاں اُن پر ہمیشہ گراں گزرتی رہیں۔

ویراں ہے میکدہ ، خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

سوال کرنا ابراہیم و سقراط کی دیرینہ سُنّت ہے۔ سوالوں ہی کے وسیلے سے انسان شعور و عرفان تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ فیض صاحب نے بھی حقیقت شناسی کی راہ سوالوں ہی کے ذریعے طے کی۔ اسی دوران وہ سوشلسٹ نظریات سے بھی روشناس ہوئے اور ان کے فکر و احساس کا افق بھی وسیع ہوا۔ اب وہ پوچھنے لگے کہ یہ دنیا صدیوں سے 'تاریک بہیمانہ طلسم' میں کیوں گرفتار ہے، یہاں کوچۂ و بازار میں جسم و جاں کا بیوپار کیوں ہوتا ہے اور ؎

یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

سوشلزم کی کتابوں میں ان سوالوں کے جواب موجود تھے اور حالات کو بدلنے کے طریقے بھی بتائے گئے تھے لیکن انسان دوستی کے اصولوں کو اپنانے سے کہیں زیادہ مشکل اُن کو حتمی تجربوں میں حل کرنا ہے۔ فیض صاحب نے اپنے فکر و فن کا رُخ تو متعین کرلیا تھا لیکن اُصولِ زیست کو جذبۂ عشق میں تبدیل کرنا، وہ بھی ایک رومان پسند شاعر کے لیے آسان نہ تھا۔ وہ عرصے تک اس تذبذب میں مبتلا رہے کہ ؎

واں جائیں یا نہ جائیں
نہ جائیں کہ جائیں ہم

اُن کی نظم 'سوچ' اُن کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے، البتہ اسی نظم میں نئے آدرش کی سچائی بھی جذبۂ عشق بن کر اُبھرتی ہے۔ شاعر کی سوچ میں جو تبدیلی آئی ہے

محبوبہ اُس پر حیران ہے۔ وہ شاعر کی غمگینی کا سبب دریافت کرتی ہے تو شاعر کہتا ہے کہ

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری

وہ پوچھتی ہے کہ کیا تم کو میری جُدائی کا غم ستاتا ہے تو شاعر جواب دیتا ہے کہ نہیں ۔

تو گر میری بھی ہوجائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے

البتہ اپنے غم کا مداوی یہ ہے کہ پاپ کے پھندوں اور ظلم کے بندھنوں کے سبب دنیا جس غم میں گرفتار ہے اُس کو اپنا لیا جائے ۔

بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سُکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

شاعر جانتا ہے کہ اس راہ میں رَن پڑے گا۔ 'سر پھوٹیں گے، خون بہے گا' مگر اُس کو یقین ہے کہ 'خون میں غم بھی بہہ جائیں گے' کیونکہ جو قوتیں غمِ ذات کا سبب ہیں، وہی معاشرے کی گردن کا سنگِ گراں بھی ہیں۔ غمِ ذات نے جب غمِ زمانہ کا امرت پی لیا تو شاعر کی لَے دو آتشہ ہوگئی۔

اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دِل
ہر داغ ہے اِس دِل پہ بجز داغِ ندامت

محبوب سے مکالمہ جاری ہے مگر محبوب فقط فرد نہیں رہتا بلکہ پوری قوم شاعر کی محبوب بن جاتی ہے۔ شاعر قوم کو تسلی دیتا ہے کہ

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم

آج سہنا ہے ، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اس نظم میں جس کا پہلا مصرع 'چند روز اَور مری جان فقط چند ہی روز' ضرب المثل بن گیا۔ فیض صاحب نے 'قطرے میں دجلہ' کا منظر دکھایا تھا اور یہ کہہ کر ہماری اشک شوئی کی تھی کہ مفلس کی قبا میں درد کے پیوند اور حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد 'اجداد کی میراث' ہے اور وہ دن دُور نہیں جب 'سطوتِ اسباب' مٹ جائے گی مگر یہ شاعر کی خوش فہمی تھی۔ درد کا یہ لمحہ بڑھتے بڑھتے اتنا طویل ہوگیا کہ چالیس سال بعد آج بھی۔

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں

'نقشِ فریادی' کی دو نظمیں — 'رقیب سے' اور 'تنہائی' — اپنی ندرت تخیل کے باعث ہمارے ادب میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ رقیب پر طنز و تحقیر کے تیر برسانا اُردو اور فارسی شاعروں کی دیرینہ روایت ہے البتہ اس صدی میں یہ روایت رفتہ رفتہ متروک ہوگئی چنانچہ ترقی پسند شاعروں میں رقیب کا تذکرہ شاید ہی ملے۔ اگر ملے گا تو مہر و وفا کے رشتوں کی ناپائیداری یا زمانے کے تغیرات کے حوالے سے مثلاً مجاز کہتے ہیں کہ

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے، کیا فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سُونی نہ رہی، کچھ اُٹھ بھی گئے، کچھ آ بھی گئے

خود فیض صاحب نے بھی ابتدائی دور کے بعد رقیب کا ذکر پھر کبھی نہیں کیا۔ وہ رقیب کو اپنا حریف نہیں بلکہ ہم راز و ہمسفر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ ۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم اُلفت کے
اتنے احساں کہ گنواؤں تو گنوا بھی نہ سکوں

وہ رقیب کے ناتے محبوب کے لب و رخسار کی یادیں تازہ کرتے ہیں لیکن عشق اگر ہوسناکی نہ ہو بلکہ درد کا رشتہ ہوجائے تو اس سے نفس کی تطہیر ہوتی ہے اور نظر میں وسعت

آتی ہے۔ شاعرِ غمِ اُلفت کے ایک چراغ سے اَن گنت چراغ روشن کرتا ہے۔ اُس کو دوسروں کے دُکھ درد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ محبت اُس کا آدرش بن جاتی ہے۔ اسی عشق کے طفیل شاعر نے

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس وحرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

اُردو شاعری تنہائی کی اذیتوں سے جو احساسِ بیگانگی کی سب سے خطرناک شکل ہے، بخوبی واقف ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے تنہائی کا ماتم نہ کیا ہو۔ کبھی 'زمانے کی قدر ناشناسی' کے شکوے کے رُوپ میں، کبھی 'بے مہریٔ یاران وطن' کے گلے کے طور پر۔ لیکن فیضؔ صاحب کی 'تنہائی' میں بے سُود انتظار کا جو کرب ہے، تنہائی کو یکجائی میں بدل دینے کی جو تڑپ ہے وہ ہم کو کہیں اور نہیں ملتی۔ تنہائی کے پھیلتے سائے قدموں کے سراغ مٹا دیتے ہیں اور تنہائی کا منظر ایک زندہ پیکر بن کر بول اٹھتا ہے کہ

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

سُود وزیاں کے اس بازاری معاشرے میں ہر شخص لاکھوں کے ہجوم میں بھی تنہا اور بے یارو مددگار محسوس کرتا ہے حتّٰی کہ اُس کی قوت، محنت اور محنت کی پیداوار بھی اُس کی اپنی نہیں رہ جاتی۔ تنہائی کی المناکی اُس سے پوچھئے جس کے لیے روٹی پیٹ کی آگ بجھانے کا واحد ذریعہ ہو۔ وہ ہر رات کسی نہ کسی گاہک کا انتظار کرتی ہے اور اگر گاہک نہ آئے تو اُس کو 'اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل' کرنا پڑے۔

شاعر نے اپنی نفسیاتی الجھنوں کا حل تو تلاش کر لیا مگر یہ سوال باقی رہا کہ شاعروں کے قبیلے کا گرد پیش زندگی سے کوئی واسطہ ہے یا محبوبِ خوش ادا کی ثنا وصفت ہی اُس کا

کام ہے۔ فیضؔ صاحب کی نظم 'موضوعِ سخن' اُن سخنوروں پر ایک طنز ہے جو اپنی وارداتِ قلبی کی آرائش میں اتنے محو ہیں کہ اُن کو سامنے کی تلخ حقیقتیں بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں، ایک طرف حُسنِ دل آرا ہے، اُس کی خوابیدہ سی آنکھیں ہیں، رنگ ورُخسار پر غازے کا ہلکا سا غبار ہے اور صندلی ہاتھوں پر حنا کی دھندلی سی تحریر کھینچی ہے دوسری جانب صدیوں کے سُرخ وسیہ سائے ہیں، موت اور زیست کی صف آرائی ہے، حسین کھیت ہیں جن میں فقط بھوک اُگتی ہے، قید خانے کی پُر اسرار دیواریں ہیں 'جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ' اور خوابوں کی مقتل گاہیں ہیں مگر فیضؔ صاحب کے بقول ہمارے شاعروں کو ان بھیانک حقیقتوں سے کوئی سروکار نہیں، وہ تو کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں اور اس کے جسم کے دلآویز خطوط کے طلسم میں گرفتار ہیں۔

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

فیضؔ صاحب بڑے صلح پسند اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے۔ اُن کا لہجہ عموماً بہت نرم ہوتا تھا حتّٰی کہ اُن کی للکار کی لَے بھی بہت مدھم ہوتی تھی۔ وہ جلالی نہیں بلکہ جمالی شاعر تھے مگر اُن کی نظم 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' 'نقشِ فریادی' کی طرزِ فغاں سے بالکل جُدا ہے اور اُن کے مزاج سے بالکل مختلف۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی رجزیہ نظم فیضؔ صاحب کے قلم سے پھر کبھی نہ نکلی۔ موضوع کی رعایت سے مختصر بحر کا انتخاب، لفظوں کی کفایت، جذبات کا جوش وجلال اور دلیرانہ للکار۔

البتہ فیضؔ صاحب کی نظم 'کُتّے' ہم لوگوں کو بہت بُری لگی تھی کیونکہ انہوں نے یہ حقارت آمیز استعارہ عوام کے لیے استعمال کیا تھا اور وہ بھی ایسے زمانے میں جب آزادی کی جدوجہد شباب پر تھی اور لوگ جاگ اُٹھے تھے لہٰذا اُن کی 'سوئی ہوئی دُم' ہلانے کی ضرورت باقی نہ تھی۔

بارہ بجے کے قریب جب محفل برخواست ہوئی تو ہم لوگوں پر 'نقش فریادی' کا اتنا اثر تھا کہ سارے راستے اُسی کی گفتگو ہوتی رہی۔ ہم لوگوں کو جب اپنا کوئی پسندیدہ شعر بھول جاتا تو بجلی کے کھمبے کے پاس رُک کر کتاب کے ورق اُلٹنے لگتے۔

اس واقعے کو دو ڈھائی برس گزر گئے۔ یہاں تک کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور ہٹلر کی فوجوں نے ایک ہی ہلّے میں مغربی یورپ کو روند ڈالا۔ فرانس نے ہتھیار ڈال دیے، پیرس پر نازیوں کا جھنڈا لہرانے لگا اور برطانوی فوجوں نے بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی۔ تب ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے اچانک سوویت یونین پر حملہ کر دیا اور چند ماہ کے اندر ہی نازی سپاہ لینن گراڈ اور ماسکو کے مضافات تک پہنچ گئی۔ اس دوران جاپان نے بھی اعلانِ جنگ کر دیا اور جاپانی فوجیں انڈونیشیا، ملایا اور برما کو تسخیر کرتی ہوئی بنگال کی سرحد تک آ گئیں۔ فیضؔ صاحب کے بقول تیرگی امنڈتی چلی آ رہی تھی اور یوں لگتا تھا گویا فاشزم کا اندھیرا پوری دنیا پر مسلّط ہو جائے گا۔

ان بدلے ہوئے حالات کے باوصف ہندوستان کے وطن پرست حلقے بڑے شش و پنج میں مبتلا تھے۔ ایک طرف عالمی سیاست کا تقاضہ تھا کہ مساعی جنگ میں پوری تن دہی سے شرکت کی جائے۔ دوسری طرف غلامی کی زنجیریں پاؤں پکڑتی تھیں۔ اسی اثنا میں لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر سوم ناتھ چب نے ایک کُل ہند مشاعرے کا منصوبہ بنایا۔ چب صاحب پطرس صاحب کے چہیتے اور فیضؔ صاحب کے پُرانے دوست تھے۔ وہ اُردو شاعری کا بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے لیکن روایتی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے، لہٰذا مشاعرے میں شرکت کے لیے انہوں نے فیضؔ، مخدومؔ محی الدین، مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، سردار جعفری اور جذبیؔ کو دعوت دی مگر پرانی نسل کے کسی شاعر کو نہیں بُلایا۔

فیضؔ صاحب سے ہم لوگوں کی پہلی ملاقات اسی مشاعرے کے ناتے ہوئی۔ وہ

صاحبزادہ محمود الظفر اور اُن کی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں کے ساتھ ٹھہرے تھے۔

صاحبزادہ محمود الظفر اور رشید جہاں کا نام ہم نے افسانوں کے مجموعے 'انگارے' کے سلسلے میں سُنا تھا۔ یہ مجموعہ جس میں محمود الظفر اور رشید جہاں کے علاوہ سجاد ظہیر اور پروفیسر احمد علی کے افسانے بھی شامل تھے، (۱۹۳۳ء ۔ ۱۹۳۴ء) میں شائع ہوا تو رجعت پرست حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ ملاؤں نے ان افسانوں پر فحاشی اور عریانی کا الزام لگایا، اخباروں اور جُمعے کے خطبوں میں افسانہ نگاروں پر گالیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور جب ان دُشنام طرازیوں سے بھی تسکین نہ ہوئی تو حکومت سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ 'انگارے' کو ضبط کر لیا جائے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کو تو اغوا اور قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں مگر اُن پر ان گیدڑ بھبکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور یہ شور و غوغا چند مہینوں میں فرو ہو گیا۔

صاحبزادہ محمود الظفر رامپور کے 'شاہی' خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی ساری تعلیم یورپ میں ہوئی تھی۔ انگریزی میں شعر کہتے تھے، افسانے لکھتے تھے اور بڑے اچھے تنقید نگار بھی تھے۔ لندن سے واپسی پر وہ کچھ عرصے تک پنڈت جواہر لال نہرو کے سیکریٹری رہے تھے اور جب جنگ چھڑی تو اُن کو بھی دوسرے کمیونسٹوں کے ساتھ دیولی کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ چند ماہ قبل ہی رہا ہو کر آئے تھے اور صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ کمیونسٹ پارٹی اٹھارہ انیس سال کے بعد پہلی بار غیر قانونی جماعت قرار دی گئی تھی۔

لکھنؤ ریڈیو کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا تھا۔ اس مشاعرے میں مخدومؔ نے اپنی مشہور نظم 'استالین' بڑے جوش سے پڑھی تھی اور سارا ہال تعریفوں سے گونج اٹھا تھا۔ آخر میں فیضؔ صاحب کی باری آئی انہوں نے اپنی دو نظمیں — 'اے دِل بیتاب ٹھہر' اور 'سیاسی لیڈروں سے' — سُنائیں جو حالات کے عین مطابق تھیں۔ فیضؔ صاحب کو اس حقیقت سے انکار نہ تھا کہ وطن ہنوز غلام ہے اور 'ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز' لیکن اُن کے

بقول نازیوں کی یلغار کے باعث 'تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے'۔ وہ جانتے ہیں کہ محبانِ وطن فاشزم کی فتح نہیں چاہتے، نہ اُن کو غلبۂ ظلمت منظور ہے تو ایسی صورت میں کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اس معرکۂ ظلمت و نور کے خاموش تماشائی بنے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں حالانکہ 'تیرا سرمایہ یہی ہاتھ تو ہیں' کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ یہ ہاتھ جو ہماری قوت تخلیق کے اظہار کا ذریعہ ہیں، قلم ہو جائیں۔ کیا ہمارے سیاسی لیڈروں کو آخر شب کے اندھیرے میں 'غازۂ رُخسارِ سحر' کی جھلک نظر نہیں آتی اور وہ نہیں دیکھتے کہ

جابجا نُور نے اِک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

ریڈیو کا مشاعرہ ختم ہوا تو ہمارے گھر پر ہائے وہُو کی محفل جمی اور ساری رات جام و مینا سے ماہتاب کا نُور برستا رہا۔ شعرا ترنگ میں تھے اور عالمِ کیف و مستی میں — کبھی وہ اپنے اشعار گاتے اور کبھی دوسروں کے۔ البتہ شمع بزم فیضؔ صاحب ہی کی ذات تھی۔ انہوں نے پیار سے ہم سبھوں کا دِل موہ لیا تھا اور تکلف کے تمام حجابات دُور ہو گئے تھے۔ جس کسی کو 'نقشِ فریادی' کی کوئی نظم یا غزل یاد آ جاتی تو وہ خود سنانے لگتا یا فیضؔ صاحب سے فرمائش کر دیتا اور فیضؔ صاحب کو فرمائش پوری کرنی پڑتی۔

اس لُطفِ صحبت کو کئی مہینے بیت گئے۔ اس اثنا میں فیضؔ صاحب نے ہیلی کالج آف کامرس لاہور سے جہاں وہ انگریزی پڑھاتے تھے استعفیٰ دے دیا اور فوج کے شعبۂ نشر و اشاعت سے وابستہ ہو کر دہلی میں منتقل ہو گئے اور سردار جعفری اور مجھ کو سجاد ظہیر نے بمبئی طلب کر لیا جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ اخبار 'قومی جنگ' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

بمبئی نیشنلسٹوں کا شہر تھا۔ وہاں کی صنعتی اور کاروباری زندگی پر وطن پرستوں کا قبضہ تھا۔ مِل مالک، ساہوکار اور بڑے دکاندار گجراتی یا پارسی تھے، البتہ مزدور زیادہ تر

مرہٹہ تھے یا شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے ہندو مسلمان آبادکار جنہوں نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا دفتر بھی وہیں تھا۔ شام کے وقت جب مِل مزدور کام سے چھوٹتے تھے تو دادر، پریل اور وورلی کی سڑکوں پر تِل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی اور یوں لگتا گویا کوئی فوج گذر رہی ہو۔ فلمی صنعت کا سب سے بڑا مرکز بھی اُن دِنوں بمبئی ہی تھا۔ بمبئی ٹاکیز کی فلموں نے جن کی روحِ رواں دیوی کا رانی تھیں سارے ملک میں دھوم مچا رکھی تھی۔ بمبئی ٹاکیز کی بدولت ہندوستانی فلموں کا معیار بہت اُونچا ہو گیا تھا اور 'شریف' گھرانوں کے پڑھے لکھے نوجوان — لڑکے اور لڑکیاں — فلموں میں کام کرنے لگے تھے۔ بمبئی ٹاکیز کے علاوہ وہاں اور بھی بہت سے اسٹوڈیو تھے جن میں محبوب اسٹوڈیو اور کاردار اسٹوڈیو بہت بڑے تھے۔ فلمی صنعت کے فروغ کی وجہ سے بیشمار موسیقار، اداکار، آرٹسٹ اور ادیب روزی روزگار سے لگے ہوئے تھے۔ بمبئی سے اُن دِنوں انگریزی، ہندی، گجراتی اور مرہٹی سے قطع نظر اُردو کے بھی کئی روزنامے اور ہفت روزہ اخبار شائع ہوتے تھے۔

اُردو کے بہت سے چوٹی کے ادیبوں، شاعروں نے بھی اپنی قسمت آزمائی کے لیے بمبئی ہی کو منتخب کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے جو ۱۹۳۶ء سے وہیں بس گئے تھے، صحافتی اور فلمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ کرشن چندر نے ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی تھی، افسانے اور ناول لکھتے تھے اور فلم بنانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے تھے۔ سعادت حسن منٹو ایک ہفت روزہ فلمی پرچہ نکالتے تھے اور فلموں کے مکالمے لکھتے تھے۔ پنڈت سُدرشن، ساغرؔ نظامی، کرشن کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ، وشوامتر عادلؔ، مجروحؔ سُلطان پوری، عصمت چغتائی اور اُن کے شوہر شاہد لطیف سب وہیں جمع تھے۔ کیفی اعظمی جو ہم سب میں کم عمر تھے 'قومی جنگ' میں ہم لوگوں کے ساتھ تھے اور اُن کی شاعری کا سُرخ گلاب آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس باقاعدہ ہوتے تھے

جن میں اُردو، مرہٹی اور گجراتی کے ادیب اپنی اپنی تخلیقات پڑھ کر سناتے تھے' نیا ادب' جس کو ہم لوگوں نے لکھنؤ میں شروع کیا تھا اَب سہ ماہی رسالے کی شکل میں بمبئی سے نکلنے لگا تھا۔ حضرت جوش ملیح آبادی جو پونا میں شالیمار اسٹوڈیو سے وابستہ تھے ہر مہینے دو مہینے کے بعد جب بمبئی تشریف لاتے تو ادبی محفلوں کی رونق اور بڑھ جاتی۔

ایک دن ہم لوگ' قومی جنگ' کے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ فیضؔ صاحب فوجی وردی پہنے چلے آرہے ہیں۔ اُن کی فوجی ملازمت کا علم تو سبھی کو تھا مگر شاعر کو اس لباس میں دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ بہرحال دو تین دن خوب ہنگامہ رہا۔ کبھی سمندر کے کنارے، کبھی کسی دوست کے گھر پر۔ ایک محفل میں جہاں سبھی ترقی پسند ادیب موجود تھے تھوڑی سی بدمزگی بھی ہوگئی۔ ہوا یوں کہ حاضرین کا اصرار تھا کہ آج شام فقط فیضؔ صاحب کے شعر سنے جائیں گے مگر ساغرؔ نظامی اپنا کلام سنانے کے لیے مچلنے لگے۔ آخر کرشن سے نہ رہا گیا کہنے لگا ساغرؔ صاحب آپ کا گانا پھر کبھی سُن لیں گے، آج تو ہم فیضؔ کے شعر سننے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اس فقرے پر سب لوگ ہنسنے لگے تو ساغرؔ آگ بگولہ ہوگئے اور کرشن کو غضب آلود نظروں سے گھورتے ہوئے بولے، اچھا تو میں گویا ہوں، گویا ہوں، گویا ہوں اور پھر ڈاڑھیں مار کر رونے لگے۔ بنّے بھائی اور ذوالفقار بخاری صاحب نے سمجھا بجھا کر چُپ کرایا مگر ساغرؔ تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر چلے گئے۔

فیضؔ صاحب نے کہا تھا کہ' رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو' اور یہ لہو اس کثرت سے بہا کہ وولگا، ڈان، ڈینپرؔ اور ڈینوبؔ کا پانی لہو رنگ ہوگیا۔ استالین گراڈ کے تاریخی معرکے میں ڈیڑھ لاکھ جرمن سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور جب سوویت یونین کا جوابی حملہ شروع ہوا تو سُرخ فوجوں نے برلن پہنچ کر ہی دم لیا۔ فاشزم نے شکست کھائی۔ ہندوستان میں سیاسی قیدی رہا ہوئے۔ برطانیہ کے وزارتی مشن لندن سے دہلی

آنے جانے لگے۔ کانگریس اور مُسلم لیگ سے گفت وشنید ہونے لگی اور اقتدار کی منتقلی کے دن آگئے۔ آخر طے پایا کہ ملک کو ہندوستان اور پاکستان دو آزاد مملکتوں کی شکل میں تقسیم کر دیا جائے گا اور تب ہندو، مسلمان اور سکھ سُورما اپنے ہم وطنوں کے خون سے ہولی کھیلنے لگے۔ لاکھوں بے گناہ جان سے گئے، عورتوں کی آبرو سرعام لوٹی گئی، اُن کی چھاتیاں کاٹی گئیں اور اُن کے دودھ پیتے بچوں کو اُن کی آنکھوں کے سامنے برچھیوں پر اُچھالا گیا۔ ان المیوں سے بھی شاید بڑا المیہ ساٹھ لاکھ خاندانوں کی خانہ بربادی تھی جن کو اپنے پُرکھوں کی سرزمین چھوڑ کر اجنبی علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ دیارِ غیر میں جن خوش نصیبوں کو مالِ غنیمت ہاتھ آیا وہ تو عیش کرنے لگے لیکن اکثریت کے شب و روز آزادی کے سنہرے خوابوں کی نذر ہوگئے۔ جب ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو خریت کا خونی آفتاب طلوع ہوا تو اہلِ نظر نے دیکھا کہ ؎

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیمِ ہند کے وقت ملک میں جو انسانیت سوز سانحے پیش آئے وہ برسوں ہمارے ادب کا موضوع بنے رہے۔ امرتا پریتم، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، ساحرؔ لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی غرضیکہ شاید ہی کوئی حساس اہلِ قلم تھا جس نے اپنی تحریروں میں فسادیوں کی بہیمانہ حرکتوں پر غم اور غصے کا اظہار نہ کیا ہو۔

فیضؔ صاحب فسادات کے زمانے میں لاہور میں' پاکستان ٹائمز' کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اُن دِنوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ جان ہتھیلی پر رکھ کر دفتر آتے جاتے تھے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وغارت گری کے خلاف متعدد اداریے لکھے اور فریقین سے پُر امن رہنے کی اپیلیں بھی کیں لیکن

وہ اپنی صحافتی ذمے داریوں میں شاید اتنے مصروف رہے کہ اس دوران میں شعر نہ لکھ سکے۔ البتہ اپنی نظم 'صبحِ آزادی' میں انہوں نے لوگوں کے جذبات واحساسات کی اتنی سچی ترجمانی کی کہ وہ نظم اس عہد کا محاورہ بن گئی۔ اس نظم میں شکوہ ہے، طنز ہے، دبی دبی سی برہمی ہے اور اس تلخ حقیقت کا اظہار بھی کہ

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدۂ ودِل کی گھڑی نہیں آئی

اِس نظم پر دائیں جانب سے بھی اعتراض ہوئے اور بائیں جانب سے بھی۔ دائیں بازو والوں نے تو اس پر آزادیٔ وطن سے صریحاً غداری کا فتویٰ صادر کیا اور یہ الزام لگایا کہ فیضؔ سرے سے پاکستان ہی کے خلاف ہیں۔ فیضؔ کے دشمنوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ انہوں نے اس نظم میں ریڈ کلف ایوارڈ کی کھل کر مذمت کیوں نہیں کی۔ یہ بزرجمہر 'داغ داغ اُجالا' اور 'شب گزیدہ سحر' کے استعاروں کی بلاغت کو سمجھ ہی نہ سکے۔

بائیں بازو کے بعض نقادوں کا کہنا تھا کہ یہ نظم بہت مبہم ہے۔ اُن کی نظر میں نظم کی عمومیت ہی اُس کا سب سے بڑا نقص ہے کیونکہ بقول اُن کے نظم کا عنوان اگر ہٹا دیا جائے تو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ یہ نظم آزادی کی نوعیت پر تنقید ہے۔ ان کو یہ بھی شکایت تھی کہ رومانوی علامتوں کی کثرت سے نظم کا سیاسی تاثر کمزور ہوگیا ہے۔ یہ حضرات مرزا غالبؔ کو تو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ وساغر کو حوالے سے کریں لیکن فیضؔ صاحب کو یہ حق دینے کو تیار نہیں۔

ادب ایک انکشاف ہے۔ بڑا ادیب معاشرے اور فرد کے باطنی تموجات اور محرکات کا سراغ لگاتا ہے، جو پنہاں ہے اُس کو عیاں کرتا ہے اور حقائقِ ہستی کے اُن گوشوں کو روشن کرتا ہے جو عموماً ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ہر صاحبِ فکر شاعر کی اپنی مخصوص لفظیات اور رمزیات بھی ہوتی ہیں جن کے سہارے وہ اپنی بات دوسروں

تک پہنچاتا ہے لہٰذا اُس کے مطالب ومفہوم کی تہ تک پہنچنے کے لیے اُس کی لُغت سے، اس کی علامتوں اور استعاروں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ مرزا غالبؔ جب کہتے ہیں کہ ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
جب غم ہی جانگداز ہو غمخوار کیا کریں

تو شمع سے اُن کی مراد عام محفلوں میں جلنے والی شمع نہیں بلکہ لال قلعے کی آخری شمع تھی جو چراغِ سحری ہورہی تھی اور اگر تشریح کو اور وسعت دیں تو شمع سے مراد وہ معاشرتی نظام ہوگا جو چند دنوں کا مہمان تھا اور جس میں اب زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی تھی۔

علامہ اقبالؔ کے کلام میں تو اس نوع کے استعارے بہ کثرت ملتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اب اگر کسی شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ اقبالؔ نے یہ نظم انقلابِ روس سے متاثر ہوکر لکھی تھی اور آفتابِ تازہ سے اُن کی مراد نیا اشتراکی نظام تھا تو وہ بھی اقبالؔ پر وہی اعتراض کرے گا جو فیضؔ پر کیا جاتا ہے لیکن اس شعر کی خوبی یہی ہے کہ ایک مخصوص واقعے سے نسبت رکھنے کے باوجود اُس کی آفاقیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ قطرے میں دجلے کی جھلک دکھانا اور جُز میں کُل کا منظر پیش کرنا واقعی بچوں کا کھیل نہیں ہے اور اگر ہم جُز اور کُل کے رشتے کو نہ سمجھ سکیں تو یہ ہماری فہم کا فتور ہے، شاعر کا قصور نہیں۔ فیضؔ اور کلامِ فیضؔ کے ایک نہایت روشن خیال مدّاح کو بھی یہی شکایت ہے کہ:

'فیضؔ کمٹ منٹ کے شاعر ہیں لیکن یہ کمٹ منٹ اشعار کی سطح پر تیرتا نظر نہیں

آتا۔ اگر کسی کو اُن کے خیالات ونظریات کا پہلے سے پتہ نہ ہو تو محض اُن کے
کلام سے سُراغ لگانا مشکل ہے'[1]

مگر فن کی خوبی تو یہی ہے کہ فن کار کی وابستگی سطحِ آب پر نہ تیرے ورنہ وہ آرٹ نہیں بلکہ خالص پروپیگنڈہ بن جائے گا۔ اس کے برعکس فن کا کمال یہ ہے کہ فن کار کی وابستگی کی لہریں تہِ آب گہرائیوں میں آہستہ آہستہ بہیں۔ یوں بھی فیضؔ صاحب چیخنے چلّانے کے قائل نہیں تھے بلکہ زیرِ لب گفتگو کرنے کے عادی تھے اور اُن کو یقین تھا کہ میرا قاری میرے اشاروں کنایوں کی تہ تک پہنچنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ فیضؔ صاحب کی نظمیں بھی غزل کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ وہی غزلوں کا سا سوز و درد، وہی حسن وعشق کی سی میٹھی میٹھی زبان، وہی رس بھری نغمگی، وہی ترکیبیں، بندشیں اور خیالی تصویریں، غرضیکہ اُن کی نظموں کی ساری فضا غزل کی ہے، حتیٰ کہ اُن کے سیاسی مرثیے بھی غزل کا احساس دیتے ہیں۔ اُن کا یہی حُسنِ بیان ہے جس کے باعث وہ اشخاص بھی جو فیضؔ صاحب کے آدرش سے اتفاق نہیں کرتے اُن کی نظموں پر سر دُھنتے ہیں۔ اُنہوں نے نظموں کے لیے اپنی غزلوں سے جُدا کوئی مخصوص آہنگ واسلوب وضع کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

اس کے باوصف اُن کی شاید ہی کوئی نظم ہو جو اُن کے مسلک کی واضح طور پر ترجمانی نہ کرتی ہو۔ 'مجھ سے پہلی سی محبت'، 'موضوعِ سخن'، 'لوحِ قلم'، 'شورش بربط دے'، 'طوق ودار کا موسم'، 'دو عشق'، 'نثار میں تیری گلیوں کے'، 'زنداں کی صبح وشام'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، 'افریقہ'، 'بنیاد کچھ تو ہو'، 'شورش زنجیر'، 'آج بازار میں پابجولاں چلو'، 'انتساب'، 'سرِ وادیٔ سینا'، 'دعا'، 'فلسطین'، 'دلِ من، مسافرِ من'، وغیرہ سب فیضؔ صاحب کے مافی الضمیر کی آئینہ دار ہیں۔ حیرت ہے کہ نگار پاکستان کو ان نظموں سے بھی فیضؔ صاحب کے

[1] نگار، پاکستان۔ دسمبر ۱۹۸۴ء، کراچی

خیالات ونظریات کا علم نہ ہو۔ کا حالانکہ نظموں کا ذکر ہی کیا اُن کی تو غزلیں بھی اُن کے خیالات ونظریات کی غمازی کرتی ہیں۔

اُن دنوں لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ اربابِ ذوق دو قابلِ ذکر تنظیمیں تھیں۔ اُن کی نشستیں ہر ہفتے بڑی باقاعدگی سے ہوتی تھیں۔ حلقۂ اربابِ ذوق ترقی پسندوں کے توڑ پر ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا تھا۔ اُس کے روحِ رواں وہ ادیب تھے جو سرکاری اداروں میں ملازم تھے اور ادب برائے ادب کے نظریے کی حمایت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک ٹولہ اُن اشخاص کا تھا جو اُٹھتے بیٹھے ترقی پسندوں کو بُرا بھلا کہتا رہتا تھا۔ اس ٹولے کے سرغنہ ڈاکٹر تاثیر اور آغا شورش کاشمیری مدیر 'چٹان' تھے۔ ڈاکٹر تاثیر فقط گفتار کے غازی تھے لیکن شورش کاشمیری قلم سے زیادہ جسمانی سرزنش کے قائل تھے چنانچہ انجمن نے نومبر ۱۹۴۸ء میں جب اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا تو شورش کاشمیری خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آئے۔

یہ کانفرنس لارنس باغ کے اوپن ایئر تھیٹر میں منعقد ہوئی تھی اور اس میں ملک کے قریب قریب سبھی ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ اُن حضرات نے بھی جو، اَب ترقی پسندی کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور انجمن سے لاتعلقی کا اعلان کرتے نہیں تھکتے۔ شورش کاشمیری کا طائفہ لاٹھی ڈنڈوں سے مسلح ہو کر آیا تھا۔ وہ پنڈال میں گھس کر گڑبڑ مچانا چاہتا تھا مگر کانفرنس کے منتظمین نے اس کا موقع نہیں دیا۔ کانفرنس ہوئی اور بڑی شان سے ہوئی۔

فیضؔ صاحب 'پاکستان ٹائمز' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کے صدر تھے۔ اس سلسلے میں اُن کو کسی کام سے ڈھاکہ جانا پڑا تھا مگر وعدہ کر گئے تھے کہ کانفرنس کے وقت تک ضرور واپس آجاؤں گا۔ کانفرنس کا دن آگیا لیکن فیضؔ صاحب نہ آئے۔ اب جتنے مُنہ اتنی باتیں تھیں۔ کوئی کہتا فیضؔ صاحب پیٹھ دکھا گئے۔ کوئی کہتا شاعر

آدمی ہیں بنگال کی کسی جادو گرنی نے قید کرلیا ہوگا اور جب کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شروع ہوگیا اور فیضؔ صاحب نہ پہنچے تو منتظمین بھی مایوس ہوگئے۔ مگر ابھی پیغامات پڑھے جارہے تھے کہ فیضؔ صاحب مسکراتے سگریٹ کے کش لگاتے اسٹیج پر نمودار ہوگئے۔ پنڈال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور مجمع نے تالیوں سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ فیضؔ صاحب کے بارے میں عام تاثر یہی تھا اور وہ اس تاثر کو کبھی دُور نہ کرسکے کہ وہ نہایت لاأبالی آدمی ہیں اور دوسرے شاعروں کی طرح وقت کی پابندی یا وعدے کا پاس کرنا اُن کا شیوہ نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فیضؔ صاحب ایفائے عہد کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب وہ جیل سے چھوٹ کر آئے تو کئی بار ایسا ہوا کہ اُن دعوتوں میں جو اُن کے اعزاز میں ہوتیں وہ وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے اور اُن کو میزبان سمیت دوسرے شرکا کا انتظار کرنا پڑا۔ ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ کراچی میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ فیضؔ صاحب مہمانِ خصوصی تھے مگر وقت ہوگیا اور فیضؔ صاحب نہ پہنچے۔ جو لوگ فیضؔ صاحب کی عادت سے واقف تھے اُن کو حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی کہ کہیں فیضؔ صاحب کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی۔ آخر گھنٹہ بھر بعد جب وہ آئے تو عقدہ کھلا کہ منتظمین کے حتمی وعدے کے باوجود نہ کوئی اُن کو لانے گیا اور نہ سواری بھیجی۔ آخر تنگ آکر انہوں نے خود ٹیکسی منگوائی اور آگئے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، بات کانفرنس کی ہورہی تھی۔

فیضؔ صاحب نے مختصر سی تقریر کی پھر بولے، حضرات میں نے آتے آتے ہوائی جہاز میں آج کی تقریب کے حسبِ حال ایک نظم کہی ہے، وہ پیش کرتا ہوں اور تب انہوں نے اپنی مشہور نظم 'پرورشِ لوح وقلم' سنائی۔

اُس وقت تک مسلم لیگی اربابِ اقتدار اپنے وعدے وعید فراموش کرچکے تھے اور لوگوں کے شہری حقوق پر شب خون مارنے کی ابتدا ہوچکی تھی اور قرائن بتا رہے تھے کہ

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

لیکن فیضؔ کا کہنا تھا کہ 'مداوائے الم' کی کوششوں میں ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے ؎

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ درودامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب ورُخسارِ صنم کرتے رہیں گے

ان اشعار میں مے خانہ، مے، حرم، صنم سب غزل کی اصطلاحیں ہیں۔ اب اگر کوئی صاحبِ نظر ۱۹۴۸ء کے سیاسی ماحول سے صرف نظر کرے تو اس کو یہ اشعار خالص غزل ہی کے اشعار معلوم ہوں گے لیکن ذہن پر اگر تھوڑا سا زور ڈالا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ میخانے سے شاعر کی مراد وطن ہے اور اُسی کو سرفراز و سُرخ رو دیکھنے کی دُھن اس کو لگی ہے۔ یہ نظم درحقیقت ترقی پسند ادب کا منشور تھی۔ حدیثِ دل اور غمِ دوراں کو رقم کرنے کا عہد، اہلِ ستم کی مشقِ ستم کو برداشت کرنے کا حوصلہ، مداوائے الم کا عزم، وطن کے درودیوار کی تزئین کا ولولہ اور لیلائے وطن کے لب ورخسار کو خونِ اشک سے رنگین بنانے کا وعدہ۔ فیضؔ صاحب نے ترقی پسندوں کے مسلک اور فریضوں کو چند مصرعوں میں بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کردیا اور آج بھی کہ اس نظم کو ۲۶ سال گزر چکے ہیں ترقی پسندوں کے آدرش کی اس سے جامع تشریح ممکن نہیں۔

واحد حاضر کے صیغے میں خطاب کرنا ہمارے شاعروں کا پرانا دستور ہے جو غزلوں، قصیدوں اور نظموں میں مدّت سے رائج ہے لیکن فیضؔ صاحب کو مکالمے کا وہ جدلیاتی انداز پسند ہے جس میں دو متضاد شخصیتوں یا دو متضاد ذہنی یا جذباتی کیفیتوں سے یا

آوازوں اور علامتوں کی آویزش سے ایک نئی حقیقت نمودار ہوتی ہے۔ وہ کبھی محبوبہ سے جس کی سوچ کا انداز مختلف ہے، گفتگو کرتے ہیں اور نیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں (سوچ)، کبھی رقیب سے مخاطب ہوتے ہیں جس سے زیادہ شخصیت کی ضد کون ہوسکتا ہے اور اس صورتِ ماجرا سے 'غریبوں کی حمایت' کا پہلو نکال لیتے ہیں (رقیب سے) اور وہ موضوعِ سخن میں حُسن پرستی اور حقیقت شناسی کے متضاد رجحانات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ 'شورش بربط ونے' میں یہ تضاد زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ اس میں دو آوازوں یعنی دو مختلف کیفیتوں کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلی آواز ایک شکست خوردہ قنوطی کی ہے جو ہار مان چکا ہے۔ اس کے خیال میں ؎

شادابیِ دِل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے، نمٹالیں گے

اس کے جواب میں دوسری آواز (جس کو کائنات کے قانونِ حرکت وتغیر پر پورا یقین ہے) کہتی ہے کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ؎

یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام وسحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم، قائم ہے جمال شمس وقمر

عُرفی نے کیا خوب کہا ہے۔

گماں مبر کہ چوں تو بگذری جہاں بگذشت
ہزار شمع بہ کشتند وانجمن باقیست

ترجمہ: (یہ مت سوچو کہ آپ ڈوبے تو جگ ڈوبا کیونکہ شمعیں تو بجھتی رہتی ہیں مگر انجمن باقی ہے)

لیکن پہلی آواز کہتی ہے کہ اب جینے کا مزا کیا، جب آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی ہیں، مُنہ کھولنے کی اجازت نہیں، نہ شعر وشاعری کے چرچے ہیں، نہ گانے بجانے کی محفلیں، اور ؎

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا اور جیب وگریباں طوق درسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گُل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز میں وہ شوکت وجلال، وہ عزم وحوصلہ ہے جہاں پہنچ کر یہ آواز انقلاب کا عہد نامہ بن جاتی ہے ؎

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق وسلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط ونے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصروکے
یہ شام وسحر، یہ شمس وقمر، یہ اختر وکوکب اپنے ہیں
یہ لوح وقلم، یہ طبل وعلم، یہ مال وحشم سب اپنے ہیں

فیضؔ صاحب کے نزدیک انقلاب کی راہ حیات بخش اور مرگِ آفرین قوتوں کے مابین تصادم سے ہوکر گزرتی ہے۔ اس اجتماعِ ضدین سے ان کے کلام کی اثر انگیزی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ سوچ کا یہ انداز ہم کو نظموں کے علاوہ اُن کی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی ملتا ہے۔ فراقِ ظلمت ونور، وصالِ منزل وگام، نشاطِ وصلِ حلال اور عذابِ ہجرِ حرام، ظلم کی اندھی رات اور صبحِ بغاوت کا گلشن، آگ میں پھول، داغِ داغ اجالا، شبِ گزیدہ سحر، برفاب سے جسم جو گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں، روزِ وصل کی راحتیں اور شبِ فراق کی کلفتیں، اہلِ طرب اور اصحابِ غم، اُن کی ہار، اپنی جیت، رندو محتسب، قفس اور گلشن، حق و باطل اور سرمایہ ومحنت، غرضکہ بے شمار ترکیبیں ہیں جو

فیضؔ صاحب کی جدلی رمزیات کی انفرادی خصوصیت ہے۔

مارچ ۱۹۵۱ء میں فیضؔ صاحب نام نہاد 'راولپنڈی سازش کیس' میں ماخوذ ہو کر گرفتار کر لیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان میں امریکی عفریت کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے اور ملکی سیاست میں امریکی سامراج کی گرفت تیزی سے بڑھنے لگی تھی، 'راولپنڈی سازش کیس' درحقیقت اربابِ اقتدار کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جس کا مقصد فوج کے چند محبِ وطن افسروں کو کمیونسٹ قرار دے کر راہ سے ہٹانا تھا، اور کمیونسٹ پارٹی کو جو اس وقت ملک کی سب سے فعال اور منظم سیاسی جماعت تھی ضرب لگا کر بے عمل بنانا تھا چنانچہ فوجیوں کے علاوہ فیضؔ صاحب کو جو کہ حزبِ اختلاف کے سب سے مقبول اور بااثر اخبار کے ایڈیٹر تھے اور سید سجاد ظہیر کو جو کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے، قید کر لیا گیا اور پارٹی کے سبھی عہدے داروں اور سرگرم کارکنوں کو بھی امتناعی قوانین کے تحت جیل میں بند کر دیا گیا۔

فیضؔ صاحب نے تین مہینے لائل پور جیل میں سخت قیدِ تنہائی میں گذارے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط، ان کو کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ اسی سخت گیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ[1] پھر اُن کو مقدمے کے دوسرے ملزموں کے ہمراہ فوجی پہرے میں اسپیشل ٹرین کے ذریعے حیدرآباد جیل میں منتقل کر دیا گیا اور تب مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مقدمے کی سماعت کے لیے ایک مخصوص عدالت قائم کی گئی جو تین ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل تھی حکومت نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مزید قانون شہادت

[1] مصنف نے اس مقام پر پہنچ کر شعر نقل کرنے کی جگہ چھوڑ دی تھی لیکن پھر حوالہ درج کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ وہ اشعار غالباً یہ ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
(دستِ صبا)

میں بھی ترمیم کر دی تاکہ پولیس کے رُوبرو دیئے گئے بیانات بھی ملزموں کے خلاف عدالت میں پیش کیے جا سکیں اور مقدمے کی ساری کارروائی صیغۂ راز میں رکھی گئی۔ اسی فرضی سازش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فیضؔ صاحب نے کہا تھا کہ

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

اس مقدمے میں مسٹر حسین شہید سہروردی اور مسٹر علی اطہر، صفائی کے وکیل تھے جب کہ وکیل استغاثہ کے فرائض مسٹر اے۔ کے۔ بروہی نے ادا کیے تھے۔ مقدمہ دو سال تک چلتا رہا اور آخر فیضؔ صاحب کو چار سال قید کی سزا سنائی گئی مگر اسی اثنا میں ملک میں شدید سیاسی بحران آیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت اور قومی اسمبلی دونوں کو توڑ دیا اور بہت سے قوانین بھی معطل ہو گئے۔ اس موقعے پر مسٹر منظور قادر نے قیدیوں کی جانب سے لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی اور عدالت نے اپریل ۱۹۵۵ء میں 'راولپنڈی سازش کیس' کے سب قیدیوں کو رہا کر دیا۔

اسیری کے ان چار برسوں کے دورانِ فیضؔ صاحب اور اُن کے ساتھیوں پر جو گزری اُس کی داستان میجر محمد اسحاق مرحوم نے 'زنداں نامہ' کے دیباچے میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ اربابِ قفس کی زندہ دِلی، مقدمے کی جانب ایک حقارت آمیز رویہ، مشاعرے اور قوالی کی محفلیں، درس و تدریس کی صحبتیں، فیضؔ صاحب کی عادات اور معمولات، شعر کی آمد کے قرینے، پھر منٹگمری اور لاہور کی جیلوں میں تلخیٔ ایام سے بیزاری اور اس ذہنی کیفیت کا اثر ان کی شاعری پر، میجر اسحاق نے ان اُمور کا تذکرہ بڑی محبت سے کیا ہے۔

مگر قید کی تمام پابندیوں اور کلفتوں کے باوصف یہ حقیقت ہے کہ فیضؔ صاحب کی شاعری کے سب سے بارآور دن وہی تھے اور اُن کی شاعری پر شباب وہیں آیا۔ 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' کا قریب قریب سارا کلام اسی عہد کی تخلیق ہے۔

مرزا غالبؔ نے لکھا تھا کہ

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

فیضؔ صاحب کو ستم ہائے روزگار سے تو کبھی سابقہ نہیں پڑا البتہ وہ ستم ہائے اقتدار کے مسلسل شکار ہوتے رہے لیکن سخت سے سخت حالات میں بھی وہ کبھی نا اُمید نہیں ہوئے اور نہ اُن سے 'دامانِ خیالِ یار' کبھی چھوٹا۔

اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمھاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حُسن کے نام

ہماری زبان میں 'حبسیات' کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ سیاست دانوں کے تاثرات سے قطع نظر غالبؔ سمیت ہمارے بہت سے ادیبوں کو قیدِ فرنگ کی سعادت نصیب رہی ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی جیلی کی مشقت کے دوران مشقِ سخن کرتے رہے۔ اُن کی بہت سی غزلیں اسیری کے زمانے ہی کی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی بہت سی تحریریں نظر بندی کے دور کی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے 'تاریخِ عالم'، 'آپ بیتی' اور 'ہندوستان کی دریافت' جیسی شہرہ آفاق کتابیں جیل ہی میں لکھیں، پھر تحریک آزادی کے چراغوں سے اتنے چراغ جلے کہ زندان کے گوشے روشنیوں کے شہر بن گئے۔ نئی نسل کے زنداں گزیدہ ادیبوں کی بزم کے میرِ مجلس فیضؔ صاحب ہیں۔

جیل خانہ بڑی آزمائش کی جگہ ہے۔ وہاں پہنچ کر کھرے کھوٹے کا فرق صاف ظاہر ہوجاتا ہے۔ وہ نقاب اُتر جاتی ہے جو ہم اپنی شخصیت پر چڑھائے رہتے ہیں اور دوست احباب، عزیز اقارب کے ادعائے محبت کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔ 'راولپنڈی سازش کیس' کے وقت تو خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ اچھے بھلے ہمت والوں پر بھی ہیبت

طاری تھی۔ فیضؔ صاحب کو بھی اس امتحان سے گذرنا پڑا تھا۔ اُن کے بعض ایسے قریبی دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں جن کا ان کے ساتھ روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور پوچھ گچھ ہوئی تو صاف مُکر گئے۔ یہی وہ تلخ تجربہ تھا جس کو فیضؔ صاحب نے اس شعر میں نظم کیا ہے کہ

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں

مگر فیضؔ صاحب نے راہ و رسمِ آشنائی میں اگر کچھ وقت کھویا تو قدرت نے اُن پر اپنی فیاضوں کے بے شمار در کھول دیئے۔ اُن کو ایک سے ایک 'عنبر دست' دوست ملے جنھوں نے ان کے دِل کی خانہ ویرانی کو 'حُسن دوعالم' کے خزینوں سے بھر دیا اور فیضؔ صاحب نے ان کو اپنے اشعار کے امرت سے امر بنا دیا۔

ایامِ اسیری میں فیضؔ صاحب پر دو دور آئے۔ پہلے دور کی نمائندہ اُن کی حیدر آباد جیل کے زمانے کی شاعری ہے اور دوسرے دور کا اظہار منٹگمری جیل کے کلام میں ملتا ہے۔ حیدر آباد جیل کے دو سال اُن کو دوستوں کی صحبت میسّر تھی اور وقت بے فکری سے گذارا جارہا تھا۔ مشاعرے اور قوالی کی محفلیں جمتیں۔ تاریخ، تصوف، فلسفہ اور سیاست پر بحثیں ہوتیں۔ درس و تدریس کی نشستیں ہوتیں اور فرصت کے بقیہ اوقات کھیل کود، ہنسی مذاق اور لطیفہ گوئی کی نذر ہوجاتے۔ قید کا نیا نیا تجربہ تھا جو حساس ذہنوں کے لیے کسی حیرت انگیز انکشاف سے کم نہیں ہوتا۔ مقدمے کی رسمی کارروائی سے کسی کو دل چسپی نہ تھی کیونکہ ہر شخص مقدمے کی اصل نوعیت اور آئندہ ہونے والے فیصلے سے بخوبی واقف تھا۔ فیضؔ صاحب نے اپنے اشعار میں اس عدالتی ڈھونگ کی طرف جا بجا بڑے طنزیہ اشارے کیے ہیں۔

بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہ گار کھڑے ہیں

ہاں جُرمِ وفا دیکھئے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار سردار کھڑے ہیں

سازش کے ملزم جیل میں پکنک منانے کے مُوڈ میں تھے مگر باہر لوگ مقدمے کے ذکر سے بھی کتراتے تھے اور اچھے بھلے ہمت والوں پر بھی ہیبت طاری تھی۔ ان حالات میں فیضؔ صاحب کو کسی سے چارہ گری کی توقع تو نہ تھی البتہ اس کا غم ضرور تھا کہ بعض ایسے قریبی دوستوں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں جن کے ساتھ اُن کا روز کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ اسی تلخ تجربے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
انِ دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

فیضؔ صاحب نے اپنے محبوب شاعر سوداؔ کی زمین میں جو غزل کہی ہے اُس میں غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ یارِ طرحدار کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔

قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

فیضؔ صاحب جانتے تھے کہ سازش کا جال کس کے اشارے پر بُنا جا رہا ہے۔ اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اربابِ اختیار کو اپنی حمایت کا ہلکا سا عندیہ بھی دے دیا جائے تو یہ مقدمہ چشم زدن میں داخلِ دفتر ہو جائے گا۔ شاید صاحبانِ اقتدار کی جانب سے اس قسم کی کوئی پیش کش ہوئی بھی تھی کہ وفاداری کی ضمانت دے دو تو رہا کر دیئے جاؤ گے۔ اسی کے جواب میں فیضؔ صاحب نے کہا تھا

فیض اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

حیدرآباد جیل کا ماحول تمرد، سرکشی اور خود اعتمادی کا تھا۔ فیضؔ صاحب کی اُس زمانے کی شاعری میں مبارزت کی للکار ہے، اربابِ اختیار کے جَور و ستم کے تذکرے ہیں، سنّتِ منصور و قیس کی تجدید کا عہد ہے، سرمایہ و محنت کی جنگ کی جانب اشارے ہیں، شہیدانِ وفا کی قربانیوں کے قصیدے ہیں اور غم و ہجر و فراق کا وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو دلِ بے قرار کو جینے کا حوصلہ بخشتا ہے اور شاعر کی بے چین روح کو سکون و مسرت کی خوشبوؤں سے معطر کرتا ہے۔

طاقت کا غرور وہ زہرِ ہلاہل ہے جس سے ہر نمرود خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے حالانکہ اُس کے اختیار کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے اور اُس کی خدائی کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ حق بالآخر باطل پر غالب آجاتا ہے۔ کوئی طاقت قدرت کے اس قانون کو بدل نہیں سکتی۔ فیضؔ صاحب ہم کو اس تاریخی حقیقت کی جانب بار بار متوجہ کرتے ہیں۔

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بُوئے گل ٹھہری نہ بُلبل کی زباں ٹھہری ہے

یا ؎

چاند کو گُل کرو تو ہم جانیں

فیضؔ صاحب کی مشہور قوالی 'وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے' اسی موڈ

کی غماز ہے۔

اپنے آدرش پر اعتماد اور اپنی بے گناہی پر یقین ہو تو قید کی پابندیاں تخیل کے لیے تازیانہ ہوتی ہیں ۔

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

اس دَور کی نظموں میں 'ایرانی طلبا کے نام'، 'نثار میں تری گلیوں کے'، 'شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'، 'زنداں کی ایک صبح' اور 'زنداں کی ایک شام' شامل ہیں۔

منٹگمری جیل کا زمانہ، فیضؔ صاحب کے بقول تھکن اور اُکتاہٹ کا زمانہ تھا۔ مقدمے کی سماعت دو سال بعد جولائی ۱۹۵۳ء میں ختم ہوئی اور عدالت نے فیضؔ صاحب کو چار سال قیدِ سخت کی سزا دی لیکن اس سے بڑی سزا دوستوں کی محفل کا درہم برہم ہونا تھا۔ سجاد ظہیر جو فیضؔ صاحب کے سب سے عزیز دوست تھے، مُچھ (بلوچستان) بھیج دیئے گئے اور فیضؔ صاحب کو میجر اسحاق سمیت منٹگمری جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہ قید خانہ 'عادی مجرموں' کے لیے مخصوص ہے۔ قیدیوں پر سختی اور تشدد وہاں روزمرہ کا معمول ہے اور وہاں وہی افسر تعینات کیے جاتے ہیں، بے رحمی اور سنگ دلی جن کی فطرت بن چکی ہوتی ہے۔ جیل میں داخل ہو تو آسمان سے باتیں کرتی دیواروں کا دو رویہ سلسلہ دیکھ کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ 'شاہی وارڈ' جس میں سیاسی قیدی رکھے جاتے ہیں کئی چہار دیواروں کے حصار میں واقع ہے۔ وہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا اور ہر وقت ہُو کا عالم رہتا ہے۔ اب کہاں وہ حیدرآباد کی چہل پہل اور کہاں منٹگمری جیل کا وحشت ناک سناٹا۔ اس تبدیلی سے فیضؔ صاحب کو بڑی روحانی اذیت پہنچی۔

فیضؔ صاحب منٹگمری جیل میں ستمبر ۱۹۵۳ء سے رہائی کے وقت تک قید رہے، البتہ دانتوں کے علاج کی غرض سے تھوڑے عرصے کے لیے لاہور بھی گئے جہاں انھوں

نے اپنی مشہور نظم 'اے روشنیوں کے شہر' مکمل کی۔ فیضؔ صاحب کا کہنا ہے کہ اکتاہٹ اور تھکن کی جو کیفیت مجھ پر منٹگمری جیل میں گزری اُس کی نمائندہ یہی نظم ہے۔

سبزہ سبزہ سُوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
سُست کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

مگر 'اے روشنیوں کے شہر' ہی پر کیا منحصر ہے اس دَور کے سارے کلام پر بیزاری، تلخی، تلملاہٹ اور جھنجھلاہٹ کا غلبہ ہے۔ 'ملاقات'، 'واسوخت'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، 'دریچہ'، 'درد آئے گا دبے پاؤں'، 'افریقہ'، 'یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم'، 'بنیاد کچھ تو ہو'، غرضیکہ کوئی ایسی نظم یا غزل نہیں ہے جس سے اُن کی ذہنی کیفیت، اُن کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز ظاہر نہ ہوتا ہو۔ اُن کے دل میں رہ رہ کر جو ٹیس اُٹھتی تھی، اُس کا ماجرا بیان کرنے کے لیے انہوں نے جو ترکیبیں وضع کیں اور جن علامتوں سے کام لیا وہ بھی اُن کی زخمی روح ہی کی آواز ہیں۔ آہوں کی آنچ، غم کے شرارے، درد کا شجر، درد کی رات، درد کا ہنگام، درد کا رشتہ، درد کی گدلی لہر، درد کے فاصلے اور درد کا دامن، سیہ شاخ کی کمان، خونِ گل، خاکِ آشیاں، تنہائی کا زہر، دار کی خشک ٹہنی، دریچے کی صلیبیں، اندھیرے کی فصیلیں، ہجر کی شہر پناہ، وحشی سائے، جوشِ غضب کا انگار، طیش کی آتش جرار، شعلوں کا رجز، لہو کی تال، بھالوں کے مرگ نین، بسمل پودے، لہو کی کھاد اور کوئے ستم کی خاموشی اور اسی قسم کی دوسری بندشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹگمری جیل میں فیضؔ صاحب کس شدید کرب میں مبتلا رہے۔

فیضؔ صاحب میں ضبط و تحمل اور غصے کو پی جانے کی بڑی طاقت تھی لیکن صبر و ضبط کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ آخر حالات نے اُن کو بھی میں مجبور کر دیا اور وہ چیخ پڑے کہ

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیدار گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو کہ شور حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مگر فیضؔ صاحب کے مذہبِ عشق میں برہمی روا نہیں اور نہ اُن کی شائستہ غم فطرت کو شور و غوغا پسند ہے مگر حالات ہی ایسے تھے۔

لب پر ہے تلخیٔ مئے ایام ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

رہائی کے بعد فیضؔ صاحب نے کچھ عرصے آرام کیا پھر 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز' اور 'لیل و نہار' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے دوبارہ پروگریسیو پیپرز سے وابستہ ہوگئے۔ اسی دوران میں فیضؔ صاحب صحافیوں کے ایک وفد کے قائد ہو کر چین گئے۔ اس سفر کی یادگار دو نظمیں۔ پیکنگ اوسکیانگ۔ اور ایک غزل ہے جو اُن کے چوتھے مجموعے 'دستِ تہِ سنگ' میں شامل ہے۔ 'دستِ تہ سنگ آمدہ' والی نظم فیضؔ صاحب نے اُن چہ می گوئیوں سے تنگ آ کر لکھی تھی جو پروگریسیو پیپرز کے بعض با اثر حلقوں نے اُن کے خلاف شروع کر رکھی تھیں۔ یہ وہ افراد تھے جن کو فیضؔ صاحب کا چیف ایڈیٹر ہونا بہت ناگوار گذرا تھا اور جو فیضؔ صاحب کے کسی مشورے، کسی فیصلے کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ کبھی کہا جاتا کہ میاں افتخار الدین نے یہ سفید ہاتھی خواہ مخواہ ہم پر مسلط کر دیا ہے حالانکہ اخبار تو فیضؔ کے بغیر بھی ٹھیک چل رہے تھے کبھی اُن کے شاعرانہ مزاج پر فقرے چست کیے جاتے اور کبھی اہلِ سیاست سے اُن کے ذاتی روابط پر ناک بھوں چڑھائی جاتی۔ اس صورت ماجرا سے شکستہ دِل ہو کر فیضؔ صاحب نے کہا تھا

بیزار فضا، درپئے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر وانگ ملامت کی گھٹا ہے[1]

ملک کی سیاسی فضا بھی روز بروز زیادہ گندی اور گھناؤنی ہوتی جاتی تھی۔ جنرل سکندر مرزا، جن کو فوج کی حمایت حاصل تھی سیاہ سفید کے مالک بن گئے تھے اور محلاتی سازشوں کا کاروبار عروج پر تھا چنانچہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو توڑ کر ایک واحد صوبے کی شکل دی گئی۔ سندھ اور سرحد کی صوبائی اسمبلیوں نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی لیکن اُن کی کسی نے نہ سُنی اور ون یونٹ بن گیا۔ مقصد یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کو اکثریتی صوبہ ہونے کی بنا پر قومی اسمبلی میں جو برتری حاصل تھی اُس کو ختم کر دیا جائے اور مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے نمائندوں کی تعداد برابر ہو جائے، مشرقی بنگال میں ہنگامہ شروع ہوا تو صوبائی وزارت کو توڑ کر وہاں گورنر راج مسلط کر دیا گیا۔ مغربی پاکستان میں سکندر مرزا اور مشتاق احمد گورمانی کے اشارے پر راتوں رات 'ری پبلکن پارٹی' کے نام سے ایک نئی پارٹی بنائی گئی اور صوبائی اسمبلی کے بیشتر مسلم لیگی ارکان بے چون و چرا، اس نئی پارٹی میں شامل ہو گئے اور تب نیا آئین نافذ ہوا اور سکندر مرزا جو حکومتِ برطانیہ کے ازلی نمک خوار تھے اور جن کا تحریک پاکستان یا تشکیل پاکستان سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر بن بیٹھے اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء کو یوم پاکستان کا جشن سرکاری طور پر بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔

فیضؔ صاحب اُس روز اتفاق سے دارالحکومت کراچی میں تھے، یہیں انہوں نے اس سارے تماشے اور سکندر مرزا کی رعونت و خودسری پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ

---

[1] دستِ تہِ سنگ آمدہ۔

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دِن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دِن ہے
تنگ مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ، کہ جشن کا دِن ہے
تمیزِ رہبر و رہ زن کرو نہ آج کے دِن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دِن ہے[1]

اپریل، مئی ۱۹۵۸ء میں فیض صاحب نے پروگریسو پیپرز کی چیف ایڈیٹری کو خیر باد کہا اور فلمی دنیا میں داخل ہو گئے۔ فلم ساز اختر کا روار عرصے سے ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ فلمی ذریعۂ ابلاغ کی افادیت کے وہ مدّت سے قائل تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان جیسے پس ماندہ ملک میں جہاں پڑھے لکھے لوگ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، فنی اور تعلیمی مقاصد کے لیے فلم کے تفریحی میڈیم کا استعمال بہت ضروری ہے لیکن اُن کو اپنے معیار کا کوئی ڈائریکٹر نظر نہیں آتا تھا جس کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا۔ اختر کا روار اُن کے معیار پر پورے اُترے تو انہوں نے خوشی خوشی 'جاگو ہوا سویرا' کے مکالمے اور گیت لکھے اور فلم کی شوٹنگ کے دوران کئی مہینے مشرقی بنگال میں جا کر رہے۔ یہ فلم یہاں تو نہ چل سکی لیکن یورپ، امریکہ اور سوویت یونین وغیرہ میں اس کو بہت پسند کیا گیا اور انعام بھی ملے۔

۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء کے دو سال فیض صاحب پر بہت بھاری گزرے۔ وہ پروگریسو پیپرز کے چیف ایڈیٹر تھے مگر اُونچی کرسی کی یہ زینت محض نمائشی تھی۔ اُن کے سُپرد کوئی کام نہ تھا۔ عالم برزخ کی اس بے عملی سے اُن کو بڑی کوفت ہوتی تھی اور اس کا اثر اُن کی شاعری پر بھی پڑا۔ اس کے علاوہ ملک کے حالات بھی اتنے ناگفتہ بہ تھے کہ

[1] جشن کا دِن۔

زندگی کے تاریک افق پر روشنی کی ایک لکیر بھی نظر نہ آتی تھی چنانچہ ان دو برسوں میں فیض صاحب نے فقط دو نظمیں اور دو غزلیں کہیں۔ اپنی نظم 'شام' میں انہوں نے جو خیالی تصویریں بنائی ہیں وہ بڑی پُر اسرار ہیں۔ اُن کو شام کے دھندلکے میں پرانے درخت ٹوٹے پھوٹے مندر دکھائی دیتے ہیں اور آسمان کسی پروہت کی مانند 'جسم پر راکھ ملے ماتھے پہ سیندور ملے' چپ چاپ سر نیوڑائے بیٹھا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہو نہ ہو اس بھیانک منظر کے پیچھے، جو دراصل ملک کا منظر ہے، کوئی جادوگر ضرور ہے ع

جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام

بجھے دِل کی یہ کیفیت اُن کی غزل میں اور شدّت اختیار کر جاتی ہے۔ اتنی مایوسی تو فیض صاحب کے پورے کلام میں شاید ہی ملے جتنی اس غزل میں ہے۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بُجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دِل سرِ شام بُجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہِ بُتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بُجھ گئے ہیں

دوسری نظم میں، جس کا عنوان 'تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں' ہے، فیض صاحب دوستوں سے بڑی حسرت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

دوستو! کوئے جاناں کی نا مہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا؟
اس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار
اس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا
شورِ آوازِ حق؟ نعرۂ گیرودار؟

فیضؔ صاحب کی یہ حسرت بہت جلد پوری ہوگئی۔قومی اسمبلی کے انتخابات کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ ۷اور ۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی رات میں جنرل ایوب خان نے اقتدار پر شبِ خون مارا اور ملک میں مارشل لا نافذ کردیا گیا، آئین معطل کردیا گیا، وزارتیں اور اسمبلیاں توڑدی گئیں۔اخباروں پر سنسر شپ لگ گئی اور شہری آزادیاں یک قلم سَلب کرلی گئیں۔ابھی اس سانحے کو ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ 'شورآوازِحق' سے پہلے ہی 'ہنگامۂ دارورگیر' بَر پا ہوگیااور تمام افرادجن کا خفیف سارجحان بھی بائیں بازو کی جانب تھا گرفتار کر لیے گئے۔

فیضؔ صاحب اُن دنوں ماسکو میں تھے۔ وہ اور حفیظؔ جالندھری ایفروایشیائی ادیبوں کی تنظیم کی افتتاحی تقریبات میں شرکت کی غرض سے سوویت یونین گئے ہوئے تھے۔ پاکستان میں مارشل لا لگنے کی خبر سُن کر فیضؔ صاحب کو کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ فوج کے برسرِ اقتدار آنے کی افواہیں کئی مہینے سے سرگرم تھیں اور قومی اسمبلی کے انتخابات کی مخالفت کرنے والے حلقے انتخابات کو رُکوانے کے لیے فوج سے برابر ساز باز کررہے تھے۔فیضؔ صاحب کو یقین تھا کہ پاکستان جاؤں گا تو میرا بھی وہی حشر ہوگا جو دوسرے ہم خیالوں کا ہوا، پھر بھی اُن کی حمیّت نے وطن سے دُور رہنا گوارہ نہ کیا۔ وہ پہلے لندن گئے اور لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی دن گرفتار کر لیے گئے۔

نومبر کی سنہری سہ پہر تھی۔ چوہدری سی۔ آر۔ اسلم اور ہم لاہور ڈسٹرکٹ جیل کے اسپتال وارڈ میں کُرسی بچھائے بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ ایک اسسٹنٹ سپرنٹینڈنٹ آئے اور کہنے لگے کہ آپ کا ایک مہمان آنے والا ہے۔ رات کے لیے اُس کے کھانے کا بھی بندوبست کرلیجئے گا۔ ہم لوگوں نے مہمان کا نام پوچھا تو وہ مُسکراتا ہوا یہ کہہ کر چلا گیا کہ آپ کو تھوڑی دیر میں خود ہی معلوم ہوجائے گا۔جیل میں کوئی نوگرفتار دوست آتا ہے تو بڑی خوشی ہوتی ہے، مگر ہم لوگ اس سوچ میں پڑ گئے کہ یہ نووارد کون ہوسکتا ہے۔ صبح کے اخبار میں کسی جاننے والے کی گرفتاری کی خبر بھی نہ تھی۔ پھر خیال گذرا کہ ممکن ہو کہ کسی نظر بند

نے ہم لوگوں کی طرح ہائی کورٹ میں ہیبیس کارپس کی درخواست دے رکھی ہواور عدالت میں پیش ہونے آرہا ہو۔ البتہ یہ فکر بھی تھی کہ جس کوٹھری میں ہم دونوں رکھے گئے تھے وہ کسی زمانے میں مُردہ خانہ تھی اور اُس میں دو چار پائیوں سے زیادہ کی بالکل گنجائش نہ تھی۔

ہم لوگ نئے مہمان کے لیے چشم براہ تھے کہ پھاٹک کُھلا اور کیا دیکھتے ہیں کہ فیضؔ صاحب سگریٹ پیتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں اور جیل کا آدھے درجن عملہ اُن کے ہمراہ ہے۔ خوب ہنس ہنس کے گلے ملے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ایک دن پہلے ہی لاہور پہنچے تھے۔ 'یار ابھی پرسوں ہی میں نے کراچی میں چار پانچ گھنٹے منظورقادر (وزیرقانون) سے تم لوگوں کی وکالت کی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں نے اُن کو قائل کرلیا ہے۔ مُجھ کو کراچی میں گرفتار نہیں کیا تو میں سمجھا کہ اَب کے ہماری باری نہیں آئے گی۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں، اچھے دِن گذریں گے'۔

فیضؔ صاحب لوہے کے دو بڑے بڑے بکس بھی ساتھ لائے تھے۔ ہم لوگوں نے کہا یوں لگتا ہے گویا آپ یہاں مستقل سکونت اختیار کرنے آئے ہیں۔ کہنے لگے ان میں کتابیں ہیں، باہر سنجیدگی سے جم کر پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اَب موقع مِلا ہے تو ارادہ ہے کہ کئی سال کی کسر پوری کرلوں۔

مُردہ خانے میں تین زندہ قیدیوں کی گنجائش نہ تھی لہٰذا سپرنٹنڈنٹ جیل نے بی کلاس وارڈ ہمارے لیے خالی کروایا اور اخلاقی قیدیوں کو کسی دوسرے وارڈ میں منتقل کردیا۔ رفتہ رفتہ ہماری جگہ بھرنے لگی۔ دادا فیروزدین منصور بہاول نگر جیل سے آئے، فضل الٰہی قربان بہاولپور سے، دادا امیر حیدر راولپنڈی سے اور قصور گردیزی جن پر خاص عتاب تھا (ملتان میں ان کی کئی عمارتوں کو بلڈوزر چلا کر مسمار کردیا گیا تھا) شاہی قلعہ لاہور میں پولیس کے مہمان رہ کر واپس ہوئے تھے۔

فیضؔ صاحب کی طبیعت میں گھبراہٹ یا جلد بازی بالکل نہیں تھی، وہ آہستہ چلتے

تھے، آہستہ بولتے تھے اور ہر کام سکون اور آرام سے مگر وقت پر کرنے کے قائل تھے۔ جیل میں بھی اُن کے معمولات میں فرق نہیں آیا۔ وہ صبح اُٹھ کر شیو کرتے اور کپڑے بدل کر یوں تیار ہوجاتے گویا دفتر جانا ہے۔ اخبار سے فارغ ہوئے تو کتاب لے کر دھوپ میں بیٹھ جاتے۔ گیارہ بجے کے قریب چائے یا کافی کا دور چلتا۔ ڈیڑھ دو بجے کھانے سے فارغ ہو کر وہ تھوڑی دیر آرام کرتے، سہ پہر کی چائے کے بعد ٹہلنے کا پروگرام بنتا اور اندھیرا ہونے تک احاطے میں ٹہلتے رہتے کبھی تنہا، کبھی دوسروں کے ہمراہ۔ رات کے وقت وہ عموماً دیر تک پڑھتے۔

فیضؔ صاحب کو دادا فیروز دین منصور کی گرفتاری کا بہت رنج تھا۔ دادا منصور جوانی میں ہجرت تحریک میں شامل ہو کر کابل گئے تھے۔ انھوں نے اور ان کے ہجرت کے ساتھی فضل الٰہی قربان نے کابل اور سوویت یونین کے سفر کی جو رُوداد سنائی وہ کسی ناول کی کہانی سے کم دلچسپ نہ تھی۔ وہ بیان کرتے تھے کہ امیر امان اللہ خاں نے ۱۹۲۲ء میں انگریزوں سے صُلح کر لی تو ہجرت کی تحریک بھیگے بتاسے کی طرح بیٹھ گئی۔ امان اللہ خان نے مہاجرین سے آنکھیں پھیر لیں اور مصر ہوئے کہ مہاجرین افغانستان سے اپنا ڈیرا اٹھائیں اور جہاں جی چاہے چلے جائیں لہٰذا مہاجروں کا ایک قافلہ کمال اتاترک کی جدوجہد میں شرکت کی غرض سے روسی ترکستان کی راہ سے ترکی جانے کے لیے پیدل روانہ ہوا۔

دادا منصور دمے کے دائمی مریض تھے۔ بہاول نگر جیل میں ان کی صحت اور گر گئی اور جب وہ بہاول نگر سے لاہور آئے تو پہچانے نہیں جاتے تھے۔ اُن کی دوا اور خوراک کا خاص خیال کیا جاتا تھا مگر جیل کے ڈاکٹر نے ایک دن فیضؔ صاحب کو چپکے سے بتا دیا کہ دادا منصور اب چند دنوں کے مہمان ہیں۔ فیضؔ صاحب سناٹے میں آ گئے۔ ان کو یہ اندازہ تو تھا کہ دادا منصور بہت بیمار ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ موت دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ فیضؔ صاحب نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ حکومت پر زور دیں کہ منصور کو رہا

کر دیا جائے مگر ڈاکٹر کی کیا مجال تھی جو مارشل لا والوں سے کسی سیاسی قیدی کی رہائی کی سفارش کرتا البتہ اس کی تشخیص صحیح نکلی۔ دادا منصور فروری ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے اور جون میں وفات پا گئے۔ فیضؔ صاحب شیخوپورہ میں اُن کے جنازے میں شریک تھے۔ جنازے میں سی۔آئی۔ڈی والے بھی موجود تھے، اُن کو دیکھ کر فیضؔ صاحب بولے آج ایک فائل ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گا، البتہ شاید کچھ نئے فائل کھل جائیں۔ واپس آ کر انہوں نے وہ غزل نما مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے ۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہ گذار چلے گئے

اور آخری شعر میں دادا منصور کی قید اور سی۔آئی۔ڈی کی نگرانیوں اور خفیہ رپورٹوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گنا ہگار چلے گئے

اسیری کے دن گزرتے رہے، یہاں تک کہ دسمبر کا آخری ہفتہ آ گیا۔ اُسی زمانے میں جسٹس ایم۔آر۔کیانی کا مشہور خطبہ جو کہ کراچی میں بار ایسوسی ایشن میں پڑھا گیا تھا اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں شائع ہوا۔ اس خطبے میں مرحوم نے بڑی دلیری سے مارشل لا کی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا تھا اور بڑے مزے مزے کے فقرے چست کیے تھے۔ اُس روز کا اخبار نظر بندوں کو پڑھنے کو نہیں ملا لیکن جیل میں جسٹس کیانی کے خطبے کا ہر طرف چرچا تھا اور بالآخر یہ پرچہ کسی نہ کسی طرح ہم لوگوں تک پہنچ گیا۔ اس کو پڑھ کر وہی فرحت جو سخت اُمس اور گھٹن میں تازہ ہوا کے جھونکے سے ہوتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر یہی کلمہ تھا کہ شکر ہے جمود تو ٹوٹا۔ نمرود کی خدائی کو کسی نے تو للکارا۔ قبرستان کی خاموشی میں کسی جانب سے تو 'انا الحق' کی صدا آئی۔ اس خوشی میں طے پایا کہ نئے سال کا

سواگت ذرا دھوم سے کیا جائے اور فیضؔ صاحب کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر آپ نے اس موقع پر کوئی تازہ نظم نہیں لکھی تو آپ کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ دو تین دن کے بعد یاروں نے دیکھا کہ فیضؔ صاحب پڑھتے پڑھتے اُٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں اور ٹہلتے ٹہلتے دُور تک نکل جاتے ہیں— معمولات میں معمولی سی تبدیلی اس بات کی علامت تھی کہ فیضؔ صاحب پر اشعار کی وحی نازل ہو رہی ہے اور جب ۳۱ دسمبر کی رات کو محفل جمی تو فیضؔ صاحب نے اپنی نئی غزل سنائی جس کا مطلع تھا

بیدم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

یہ غزل بھی فیضؔ صاحب کے بقیہ کلام کے مانند روایتی علامتوں اور استعاروں سے رچی ہوئی ہے۔ بیمار، دوا، شفا، درد، شبِ ہجراں، جزا، سزا، حشر، انصاف، ستمگر، وفا، جفا، ساز، نغمہ، جنوں، گریباں غرضیکہ سبھی اصطلاحیں موجود تھیں مگر فیضؔ صاحب نے ان کو نئے معنی، نئی توانائی عطا کی تھی۔ اس کی طنز آمیز رمزیت حالاتِ حاضرہ کی ترجمانی بھی کرتی تھی اور آفاقی صداقتوں کی آئینہ دار بھی تھی۔ فیضؔ صاحب ہیئت کے تجربوں سے نہیں گھبراتے مگر روایتی طرزِ بیان سے انحراف برائے انحراف کے بھی قائل نہیں بلکہ اُن کا خیال ہے کہ پرانی چیزوں میں ہنوز اتنی جان ہے کہ اُن کے ذریعے زندگی کے نئے تجربوں اور نئی حقیقتوں کی پوری کیفیت قاری تک پہنچائی جا سکتی ہے۔

نئی غزل ختم ہوئی تو فیضؔ صاحب سے پرانی چیزوں کی فرمائش کی گئی۔ پھر نصف شب کے قریب یاروں پر ایسی سرخوشی طاری ہوئی کہ سب لوگ مِل کر ان کی مشہور قوالی 'کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے' دیر تک گاتے رہے۔

مگر یہ بزمِ ہم نفساں نیا سال آتے ہی بکھر گئی۔ البتہ فیضؔ صاحب کو کئی نظموں کا مسالہ فراہم کر گئی۔ بات یہ تھی کہ اکتوبر میں جب سیاسی قیدی گرفتار ہو کر لاہور ڈسٹرکٹ

جیل پہنچے تو دوسرے ہی دن قیدیوں کے ساتھ جیل کے حکام کے ناروا سلوک پر سپرنٹنڈنٹ جیل سے خوب تو تو میں میں ہوئی۔ آئی۔ جی آئے تو اُن کو بھی کھری کھری سنائی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر نظر بندوں کو ایک ایک کر کے پنجاب کی مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا مگر اس شان سے کہ دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں سے بندھے تھے اور اُن کو جیل سے ریلوے اسٹیشن تک اور پھر ریلوے اسٹیشن سے نئے جیل تک 'مست ورقصاں' پیدل چلنا پڑا تھا۔ ہتھکڑیاں سفر میں بھی ڈھیلی نہیں کی گئی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کلائیاں ان آہنی زیوروں کی گرفت سے سوج سوج گئیں۔ اربابِ بست و کشاد سے گستاخی کرنے کی سزا اس سے کم کیا ہو سکتی تھی۔

فیضؔ صاحب سب کچھ برداشت کر سکتے تھے مگر انسان اور انسانیت کی توہین برداشت کرنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ ظلم و تشدد کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن کسی کی عزتِ نفس کو صدمہ پہنچے یا کسی کے ذاتی وقار کو مجروح کیا جائے تو وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ سرکاری حکام کے حقارت آمیز رویّے پر انہوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اُن کے حساس دِل کے اتھاہ اور پُرسکون سمندر کی تہ میں جذبات کا تلاطم بَرپا ہو گیا اور تب اشعار کے آبدار موتی ڈھلنے لگے، 'شورشِ زنجیر بسم اللہ' اور 'آج بازار میں پابہ جولاں چلو' میں انہوں نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے تجربوں کو جس شدّت سے محسوس کیا ایسی شدت تو اہلِ ستم کی جفاؤں میں بھی نہ تھی۔ وہ 'امتحانِ عشق' کے موسم کا خیر مقدم اس آن بان، اس گرمجوشی سے کرتے ہیں گویا محبوبہ کی پذیرائی کر رہے ہوں۔ گویا اہلِ جنوں دِرِ زنداں پر نہیں بلوائے گئے بلکہ خلوت کدۂ حسن میں طلب کیے گئے ہیں اور اُن کو دربارِ حسن میں اپنی دریدہ دامنی اور ناکردہ گناہی کا صِلہ ملنے والا ہے۔

تخلیقی عمل کے کرشمے بھی عجیب ہوتے ہیں، غریب لوہار اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر لوہے کو آگ میں تپا کر ہتھکڑیاں، بیڑیاں تیار کرتا ہے۔ اُس کو اس بات سے کوئی

سروکار نہیں ہوتا کہ یہ آہنی زیور وہ ظالموں کے دستِ ستم کے لیے ڈھال رہا ہے یا خود اپنے جیسے مظلوموں کے بے دست و پا کرنے کے لیے، مگر اہلِ قلم کے تخلیقی عمل کی نوعیت لوہار کے تخلیقی عمل سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ فیضؔ صاحب جب قیدیوں کو ہتھکڑیوں بیڑیوں میں بندھا دیکھتے ہیں، اربابِ وفا کے شور زنجیر کی آوازیں جب اُن کے کانوں میں آتی ہیں، اُن کی چشمِ تصور کو جب اپنے دمسازوں کا 'بازار میں پابہ جولاں' چلنا نظر آتا ہے تو اُن کے احساس کے تار لرز اُٹھتے ہیں اور 'کہرام دار و گیر' اُن کی قوتِ تخلیق کو تازیانے لگاتا ہے۔

تخلیقی عمل کی راہیں دراصل بڑی پُر پیچ ہوتی ہیں۔ اس سفر میں زمان و مکاں کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ نہ کوئی فنکار یہ بتا سکتا ہے کہ اُس کو تخلیقِ فن کی تحریک کب اور کیسے ہوتی ہے۔ یہ عمل فن کار کا بالکل ذاتی اور داخلی مسئلہ ہوتا ہے۔ تخلیق کا ہیولیٰ خود اُس کا ذہن بناتا ہے۔ اس کام میں کوئی دوسرا اُس کا شریک نہیں ہوتا، نہ ہوسکتا ہے۔ اس کی تخلیق اُس کے اپنے ارادے اور مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ یہ ہیولیٰ وہ شے ہے جس پر فنکار اپنی تخلیق کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ وہ بیج ہے جس سے تخلیق کے انکھوے پھوٹتے ہیں۔ یہ ہیولیٰ کبھی خلوت میں بنتا ہے، کبھی بھری محفل میں۔ کبھی کسی فوری حادثے سے متاثر ہوکر (فیضؔ کے کلام میں اپنے بھائی کا مرثیہ، فیروز دین منصور کا، حسن ناصر کا، میاں افتخار الدین کا، ڈاکٹر شوکت ہارون کا اور میجر اسحاق کا مرثیہ) کبھی ذاتی تجربوں کے مجموعی تاثر سے (ایامِ اسیری کا کلام) کبھی کسی ایسے واقعے سے جس کا فن کار کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہو (روزنبرگ اور ایرانی طلبا کی شہادت) لیکن وہ ان سے متاثر ہوتا ہے، پھر فنکار کے آدرشوں اور اخلاقی قدروں کی پامالی کے خلاف احتجاج۔

بہرصورت فنکار کے جذبات کو برانگیختہ کرنے اور اُس کو تخلیقِ فن پر اُکسانے کے لیے کوئی نہ کوئی داخلی یا خارجی محرک ضرور درکار ہوتا ہے۔ ابتدائی تصور یا ذہنی ہیولے کی تشکیل کے بعد تفکر کا دور آتا ہے جو تخیل اور تعقل کا آمیزہ ہوتا ہے اور تب تخلیق کا عمل

باقاعدہ شروع ہوتا ہے اور خیالی تصویریں (images) بننے لگتی ہیں۔ یہ تینوں مدارج کبھی ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں اور کبھی ان میں زمان و مکان کا فاصلہ بھی ہوتا ہے۔

اس سارے عمل میں فنکار کی اپنی نفسیات، ذہنی کیفیت، اُس کا شعور، سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ، اُس کی نظر کا زاویہ، اُس کی سماجی اور اخلاقی اقدار، اس کے جمالیاتی ذوق، اُس کی پسند ناپسند، اُس کی قوتِ تخیل، اُس کے جذبات کی شدت اور سچائی، اُس کا فنی خلوص اور زبان پر اُس کی قدرت، غرض یہ کہ بے شمار عوامل ہیں جو فنی تخلیق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ہر فن پارے پر اپنے خالق کی شخصیت کی چھاپ ضرور ہوتی ہے۔ اُس کی انفرادیت ہی اُس کو دوسروں کی فنی تخلیقات سے جُدا یا ممتاز کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی حقیقت یا واقعہ سب فنکاروں کو یکساں متاثر کرے۔ ایک حقیقت کسی فنکار کے جذبات میں ہیجان برپا کر دیتی ہے لیکن وہی حقیقت دوسرے فنکاروں کو بالکل متاثر نہیں کرتی یا کرتی ہے تو اس کی شکل مختلف ہوتی ہے مثلاً تقسیمِ ہند کے وقت ملک میں جو فسادات برپا ہوئے اور جو انسانیت سوز مناظر دیکھنے میں آئے ان سے متاثر ہوکر سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، بیدی، خواجہ احمد عباس اور دوسرے ادیبوں نے کئی بڑی دلدوز کہانیاں لکھیں مگر فیضؔ صاحب اس موضوع پر کوئی نظم نہ لکھ سکے حالاں کہ وہ لاہور میں کشت و خون کے عینی شاہد تھے۔ البتہ جب مشرقی پاکستان میں خون کی ندیاں بہیں تو فیضؔ صاحب بے قرار ہوگئے، ہر چند کہ وہ ان حادثات کے عینی شاہد نہ تھے۔ لہٰذا فنکار سے یہ سوال کہ تم فلاں واقعے پر کیوں خاموش رہے اور فلاں واقعے سے کیوں متاثر ہوئے وہی شخص کرے گا جو تخلیقی عمل کے قانون اور اُس کی منطق سے ناواقف ہوگا۔

ابتدائی تصور کبھی غیر شعوری طور پر اچانک ذہن میں آتا ہے اور کبھی شعوری طور پر کسی منصوبے کے تحت۔ ناول، افسانے، ڈرامے، مرثیے، مثنویاں اور قصیدے عموماً

منصوبے کے تحت لکھے جاتے ہیں اور فنکار پہلے اُن کا خاکہ ذہن میں بناتا ہے اور تب وقفے وقفے سے اُن میں رنگ بھرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فردوسی کا 'شاہنامہ'، مولانا روم کی مثنوی، گوئٹے کا فاؤسٹ، ٹالسٹائی کا ناول 'جنگ اور امن'، شیکسپیئر کے ڈرامے، سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدے، میرؔ اور غالبؔ کی مثنویاں، وارث شاہ کی ہیر رانجھا، شاہ بھٹائی کے رسالے، اقبالؔ کی اسرارِ خودی، ایک نشست میں نہیں لکھی گئیں۔ ٹالسٹائی نے تو اپنا ایک افسانہ 'حاجی مراد' دس برس میں مکمل کیا تھا البتہ مختصر نظمیں اور غزلیں عموماً ایک ہی نشست میں لکھی جاتی ہیں یا کم سے کم ان کا ہیولیٰ ایک وقت میں بنتا ہے۔ فنکار کے ذہن میں کوئی خیال عرصے تک گردش کرتا رہتا ہے۔ وہ اس کا ہیولیٰ بناتا، بگاڑتا رہتا ہے اور تب کسی خاص وقت میں وہ لمحہ تولید آجاتا ہے جو شاعر کی تخلیقی (urge) خلش کی تمکین اور تکمیل کا باعث ہوتا ہے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مختصر نظمیں اور غزلیں غیر شعوری یا غیر ارادی طور پر نازل ہوتی ہے لیکن اُن کی تخلیق عموماً کسی منصوبے کے تحت نہیں ہوتی بلکہ نئے یا پرانے واقعے سے متاثر ہوکر، طرحی غزلوں کی بات دوسری ہے۔ ایک زمانے میں لائل پور کاٹن ملز کے مالک ہر سال ایک مشاعرہ بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان اور پاکستان کے سبھی ممتاز شاعر شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء کے مشاعرے میں فیضؔ صاحب بھی مدعو تھے۔ مشاعرہ ڈھائی تین بجے رات کے وقت ختم ہوا اور قیام گاہ تک پہنچتے پہنچتے چار بج گئے مگر فیضؔ صاحب کو نیند نہ آئی۔ صبح سویرے اُن کے کسی ہمسفر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ فیضؔ صاحب کا بستر خالی ہے اور وہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔

'گلوں میں رنگ بھرے' والی طربیہ غزل اسی شب بیداری کا تحفہ ہے۔ اب کون بتاسکتا ہے کہ اس نشاطیہ غزل کا خیال فیض صاحب کے ذہن میں عرصے سے گھوم رہا تھا یا اُس رات مشاعرے کے کسی منظر سے، کسی شاعر کے کسی شعر سے یا صبح کی بہار آلود فضا سے متاثر ہوئے۔

طویل نظموں کا معاملہ غزلوں اور چھوٹی چھوٹی تاثراتی نظموں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ تخیل اور جذب سے زیادہ کسی بنیادی فکر، کسی مرکزی خیال کی تخلیق ہوتی ہیں جیسے لوکری شیس (۹۹-۵۵ ق م) کی طویل نظم 'اشیا کی حقیقت' جس میں اس روشن خیال شاعر نے اپی قورس کے ایٹمی فلسفے کی تشریح کی تھی یا مولانا روم یا اقبالؔ کی مثنویاں یا شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالے اور اگر اُن کی نوعیت افسانوی یا تاریخی ہو جیسے ہومر کی ایلیڈ یا فردوسی کا شاہنامہ، گوئٹے کی فاؤسٹ تو اُن میں باقاعدہ پلاٹ اور کردار نگاری کی اہمیت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ فیضؔ صاحب نے اس صنفِ سخن کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ اُن کو اسی کمی کا احساس تھا، چنانچہ مسز فیض کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> 'اصل میں اب اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ اعتماد پیدا ہوجائے تو ارادہ ہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دور کی عظیم الشان کش مکش حیات کا بیان ہوسکے، اس لیے کہ ہمارا دور شاید تاریخ کا سب سے شجاعانہ اور ولولہ انگیز دور ہے۔'

یہ خط فیضؔ صاحب نے ۱۹۵۳ء میں حیدرآباد جیل سے لکھا تھا لیکن خواہش کے باوجود ایفائے عہد کی نوبت نہیں آئی۔ ایسے کاموں کے لیے جس نظم وضبط (ڈسپلن) کی، جس فکری مشقت کی ضرورت ہوتی ہے فیضؔ صاحب کا مزاج اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ یکسوئی، سکون اور فرصت کی ضرورت درکار ہے، وہ فیضؔ صاحب کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ میرؔ اور غالبؔ کی طرح وہ چھوٹی موٹی مثنویاں بھی نہ لکھ سکے۔

فیضؔ صاحب نے قلعۂ لاہور کی قیدِ تنہائی میں 'قیدِ تنہائی' ہی کے عنوان سے ایک نظم کہی۔ وہ لائل پور جیل میں بھی تنہا رہ چکے تھے مگر وہاں اُن کے ہم قفس اُن کے 'مشفقی' شمس الدین تھے جو اُن کو کھانا پکا کر کھلاتے تھے اور نوابوں، بچوں، بھوتوں کے قصے سُنا کر فیضؔ صاحب کا جی بہلاتے تھے لیکن لاہور کے شاہی قلعے کے آداب زنداں بالکل جُدا تھے۔ وہاں

قیدیوں کو 'پوچھ گچھ' کے لیے لایا جاتا ہے اور وہ پولیس والوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سیل اُس کی اقامت گاہ ہوتی ہے۔ اُسی کے ایک گوشے میں حوائج ضروری کے لیے کموڈ رکھا رہتا ہے یا کھڈی بنی ہوتی ہے۔ پاس ہی ایک گھڑے میں پانی ہوتا ہے جو نہانے، پینے کے لیے کام آتا ہے۔ سیل مقفّل ہوتا ہے اور دروازے پر ۲۴ گھنٹے ایک مسلح سپاہی کا پہرہ ہوتا ہے۔ اُس کو قیدی سے بات چیت کرنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ قیدی کو صبح شام آدھ آدھ گھنٹے کے لیے سیل سے باہر نکال کر ٹہلایا جاتا ہے مگر اُس کو کسی دوسرے قیدی سے اشارے، کنایوں میں بھی بات چیت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سیل ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں لہٰذا گفتگو کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ صبح کو ایک گلاس چائے ملتی ہے۔ دوپہر کو دو تنوری روٹیاں اور دال اور شام کو دو، دو تنوری روٹیاں اور دال یا کوئی نہایت بدمزہ سالن۔

فیضؔ صاحب اپریل کے پہلے ہفتے میں قلعے سے رہا ہوئے البتہ رخصت ہوتے وقت پولیس افسران نے اُن کو گھیر لیا کہ جب تک آپ اپنی نئی نظمیں ہم کو لکھ کر نہیں دیں گے ہم آپ کو جانے نہ دیں گے۔ فیضؔ صاحب نے ایک دو بار ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ لوگ نہ مانے۔ فیضؔ صاحب بڑے مروّت والے آدمی تھے اور کسی سے 'نہیں' کہنا نہیں جانتے تھے لہٰذا ان کی فرمائش پوری کی۔ وہ اپنے صیادوں کی ذاتی درخواست اور خواہشوں کو بھی نہ ٹھکرا سکے۔ اصولی بات ہو تو وہ چٹان بن جاتے تھے ورنہ کسی کی ذاتی درخواست رد کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ فیضؔ صاحب کا بہت سا قیمتی وقت اسی قسم کی خدمتِ خلق میں ضائع ہو جاتا تھا۔

جن دنوں فیضؔ صاحب شاہی قلعہ میں نظر بند تھے تو جنرل ایوب خان کا فرمان شائع ہوا کہ سب وزرا اور سرکاری افسر اور اہلِ دولت اپنے اپنے اثاثوں کا گوشوارہ داخل کریں۔ اہلِ ثروت و اقتدار نے اس اعلان پر جس دیانت داری سے عمل کیا اس کا تذکرہ فضول ہے کیوں کہ فوج نے ملکی حالات کی اصلاح کے لیے حکومت پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ دولت کی لوٹ میں شریک ہونا مقصود تھا لہٰذا اثاثوں کی تفصیلات کون پیش کرتا اور کون ان

کی چھان بین کرتا۔ البتہ فیضؔ صاحب نے اس موضوع پر ایک پیارا قطعہ قلعے میں بیٹھے بیٹھے لکھا۔

ہم خستہ تنوں سے خستہ تنو، کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

رہائی کے بعد دو ایسے حادثات پیش آئے جنھوں نے فیضؔ صاحب کو بہت دُکھ دیا۔ اوّل فیروز دین منصور کی وفات جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ دوسرے جواں سال حسن ناصر کی قلعۂ لاہور میں ہلاکت۔ یہ وہی شاہی قلعہ تھا جہاں فیضؔ صاحب کچھ عرصہ پہلے مقید تھے۔

حسن ناصر کی فیضؔ صاحب سے یاری دوستی نہ تھی۔ وہ عمر میں بھی اُن سے بہت چھوٹا تھا۔ وہ کراچی میں رہتا تھا اور فیضؔ صاحب شاید ایک آدھ بار ہی اُس سے ملے ہوں مگر فیضؔ صاحب کو اس کی شہادت کا بڑا غم تھا۔ حسن ناصر کو اذیت دے دے کر مارا گیا تھا اور ایسی جگہ پر جہاں کوئی اس کے تڑپنے کی آواز بھی نہ سُن سکتا تھا۔ ظالموں نے تو اُس کی لاش بھی غائب کر دی چنانچہ نہ جنازہ اُٹھا نہ قبر کا سُراغ مِلا۔ حسن ناصر کی اس حسرت ناک موت پر فیضؔ صاحب نے 'ملاقات مری' اور 'ختم ہوئی بارشِ سنگ' دو نظمیں لکھیں۔

'ملاقات مری' پنجاب جیل کی اصطلاح ہے۔ جیل میں سیاسی نظر بندوں سے اُن کے فقط بہت ہی قریبی رشتے دار مِل سکتے ہیں، وہ بھی پندرہ دن میں ایک بار ۴۵ منٹ کے لیے، سی۔ آئی۔ ڈی کے رُوبرو۔ سیاسی قیدی سے جب کوئی ملنے آتا ہے تو پہرہ دار آواز دیتا ہے کہ چلئے آپ کی ملاقات آئی ہے۔ قلعے کے اندر یہ رعایت بھی ختم ہو جاتی

ہے، پھر حسن ناصر کی تو کوئی ملاقات آ ہی نہیں سکتی تھی کیوں کہ اُن کی والدہ اور بھائی بہن سب ہزاروں میل دُور حیدرآباد دکن میں تھے۔ اُس کی کال کوٹھری کا آہنی دروازہ تو صرف افسرانِ تفتیش سے 'ملاقات' کے لیے کھلتا تھا۔ یہ ملاقات زندگی اور موت کے دوراہے پر ہوتی تھی۔ ایک راستہ فوری رہائی اور انعام واکرام کی محل سرا کی جانب جاتا تھا اور دوسرا قربان گاہِ محبت کی جانب۔ اُس کے 'ملاقاتی' بار بار اُس سے ملاقات کرتے مگر اس انداز سے کہ

اِک ہتھیلی پہ حِنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اِک نظر زہر لیے، ایک نظر میں دارو

قلعے میں پوچھ گچھ کے دوران یہ دونوں حربے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک افسر بہت ترش رُو اور بدمزاج ہوتا ہے، دوسرا بہ ظاہر بہت نرم دِل۔ وہ قیدی سے بڑی ہمدردی جتاتا ہے اور یہ کہ میں دراصل اس تشدد اور بدسلوکی کو پسند نہیں کرتا۔ مجھ کو تمہارے ساتھ بڑی ہمدردی ہے۔ حسن ناصر اذیتیں سہتا رہا مگر نہ اس کے فریب میں آیا نہ اُس کے مظالم سے ڈرا اور تب آخری ملاقات آ گئی اور وہ تھی موت ؎

آشنا موت جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

اس مرثیے میں درد کی ٹیس ہے، زخموں کی فریاد ہے، موت کا ماتم ہے۔ دوسرا مرثیہ زندگی کے اس خونین سفر کی داستان ہے۔ وہ سفر جو کال کوٹھری کے گھپ اندھیرے میں شروع ہوا، وہ سفر جس میں خورشید وقمر کی ایک کرن بھی نہ تھی اور بارشِ سنگ سے 'خاک رہ' لب دلدار کی مانند سُرخ ہوگئی تھی اور کوئے جاناں میں شہیدِ جفا کے لہو کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ جاتے جاتے یہ سوچ رہا تھا کہ 'دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا' لہٰذا اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم — مگر رہ نوردانِ عشق کا سفر کبھی تمام نہیں ہوتا۔

عجیب بات ہے کہ ایرانی طلبا اور روزن برگ کے مرثیے بڑے جلالی ہیں۔ بڑے رزمیہ تیور ہیں۔ انقلابی روح بڑی پُر اُمید ہے۔ ان میں مجاہدوں کا جوش وغا ہے، سررزمگاہ محبت میں مبارزت اور مجادلے کا، لیکن ہم وطنوں کی شہادت کا ماتم بڑا انفعالی ہے۔ فیروز دین منصور، حسن ناصر اور میاں افتخار الدین ہر چند کہ سیاسی شخصیتیں تھیں اور آزادی کی جنگ میں ان میں سے کسی نے نہ ہار مانی نہ پیچھے ہٹے مگر اُن کے مرثیے جہد و عمل کی روح سے خالی ہیں۔ مرثیے غم کے بوجھ تلے دَب جاتے ہیں، احساس ہزیمت و شکست ہے۔ جہاں پڑھ کر غصّہ نہیں آتا، نہ خون کھولتا ہے بلکہ پڑھنے والا حُسنِ بیان کی دلکشی میں کھو جاتا ہے۔ اچھوتی علامتیں اور تشبیہیں، انوکھے استعارے اور اشارے ہم کو مسحور کر لیتے ہیں۔ مرثیے غزل بن جاتے ہیں۔ غم کی شدت، شاعر کے جذبۂ احتجاج پر غالب آ جاتی ہے ؎

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بُھلا دیا

دوستوں نے فیضؔ صاحب کے ان مرثیوں پر جب یہ اعتراض کیا کہ آپ کے اس رونے دھونے میں انقلابی روح سلب ہوگئی ہے اور ظلم و تشدد سے نفرت اور اس سے دست و گریبان ہونے کا عزم بیدار نہیں ہوتا، یہ نظمیں ہم کو رُلاتی ہیں، جگاتی نہیں تو فیضؔ صاحب نے یہی جواب دیا کہ ان دوستوں کی موت کو میں نے جس طرح محسوس کیا اُسی طرح لکھ دیا، مجھ کو بناوٹی باتیں نہیں آتیں۔

فیضؔ صاحب کہا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیے کہ کولہو کے بیل کی طرح ساری عمر ایک ہی کام میں جُتا نہ رہے ورنہ اُس کی تخلیقی صلاحیتیں شب و روز کی یکسانیت سے اُکتا کر ماند پڑ جاتی ہیں۔ انہوں نے اس کلیے پر آخر وقت تک عمل کیا۔ انہوں نے زندگی کی ابتدا میں لڑکوں کو پڑھایا، پھر فوج میں چلے گئے۔ وہاں سے نکلے تو صحافت کے میدان

میں اُترے، جیل یاترا کی، فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے اور پھر فنونِ لطیفہ کی محفل سجانے لگے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔

فیضؔ صاحب نے دس گیارہ سال اخبار نویسی کی۔ پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں اُن کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔

فیضؔ صاحب نے اخبار نویسی بڑے آن بان سے کی۔ انہوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا بلکہ امن، آزادی اور جمہوریت کی ہمیشہ حمایت کی۔ اقتدار کی جانب سے شہری آزادیوں پر جب کبھی حملہ ہوا تو فیضؔ صاحب نے بے دھڑک اس کی مذمت کی اور جس حلقے، گروہ، جماعت یا فرد سے بے انصافی کی گئی، فیض صاحب نے اس کی وکالت کی۔ فیض صاحب کے اداریے اپنی حق گوئی ہی کی بدولت مقبول نہ تھے بلکہ وہ نہایت دلچسپ ادبی شہ پارے بھی ہوتے تھے جن کو دوست دشمن سب لطف لے لے کر پڑھتے تھے۔ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ فیض صاحب انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں نہایت عمدہ نثر لکھتے تھے۔ فیض صاحب نے صحافتی اخلاق کا بھی بہت اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ اس کی وجہ سے دوسرے اخبار بھی بسا اوقات پروگریسیو پیپرز کی تقلید پر مجبور ہوجاتے تھے۔

۱۹۵۹ء میں فیض صاحب نے 'الحمرا' کا نظم ونسق سنبھالا۔ یہ تہذیبی ادارہ پاکستان بننے کے تھوڑے ہی عرصے بعد مال روڈ پر ایک متروکہ عمارت میں قائم ہوا تھا، اس کو صوبائی حکومت سے کچھ امداد بھی ملتی تھی مگر شہر میں اس کا عدم وجود برابر تھا۔ سال میں کبھی کسی فنکار نے اپنی تصویروں کی نمائش کردی یا کوئی ڈرامہ ہوگیا۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو خبر ہوئی، کسی کو نہ ہوئی۔ فیض صاحب اس دَم توڑتے ادارے کے سیکریٹری ہوئے تو اس کے تن بے جان میں نئی روح دوڑ گئی اور جس ویرانے میں اُلّو بولتے تھے اُس کے در و دیوار ساز و نغمے کی آوازوں سے گونجنے لگے۔ فیض صاحب نہ موسیقار تھے نہ اداکار، نہ مصوّر

تھے نہ مجسمہ ساز مگر ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ وہ نوجوان فنکاروں سے اتنی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے کہ جس فنکار کو دیکھو، کام ہو یا نہ ہو 'الحمرا' کی طرف کھنچا چلا جارہا ہے۔ کسی کمرے میں ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی ہے، کسی گوشے سے طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار کی آوازیں آرہی ہیں، کسی کمرے میں تصویروں کی نمائش لگی ہوئی ہے، کہیں کٹھ پتلی کے ناچ کا پروگرام بن رہا ہے اور کھلے میدان میں نوآموز مصور کھڑے کاغذ پر رنگ بھر رہے ہیں۔ فیض صاحب نے آرٹسٹوں کی سہولت کی خاطر ایک چائے خانہ بھی بنوا دیا تھا۔ چائے خانے کے سامنے لان پر آدھی رات تک چہل پہل رہتی اور بے فکرے مونڈھوں پر بیٹھے دنیا بھر کے مسائل پر بحث کرتے رہتے۔ کبھی کبھار فیض صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل کر وہیں آن بیٹھتے تو محفل کی رونق اور بڑھ جاتی۔

فیض صاحب کی کوششوں سے 'الحمرا' جلد ہی شہر کا سب سے فعّال تہذیبی مرکز بن گیا۔ وہ اُن دنوں بے حد خوش تھے۔ اُن کو اپنی مرضی کے مطابق فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے کا موقع ملا تھا اور شہر کے سبھی فنکار رضا کارانہ طور پر اُن سے بھرپور تعاون کر رہے تھے۔ فیضؔ صاحب نے چھوٹی سی ایک عارضی عمارت بھی بنوا دی تھی جہاں نوجوانوں کو مصوری کا درس دیا جاتا تھا۔ انہوں نے ایک مشہور اطالوی انجینئر سے الحمرا کی نئی عمارت کا نقشہ بھی مُفت بنوا لیا تھا اور عمارت فنڈ کی کوشش بھی شروع کردی تھی۔ فیض صاحب کی دلی خواہش تھی کہ الحمرا کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوجائے تا آنکہ ہر شہر میں آرٹ کونسل کی شاخیں کُھل جائیں اور فنونِ لطیفہ کے فروغ کی تحریک ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کرلے۔

ابتدا میں تو سرکاری حلقوں نے الحمرا کی سرگرمیوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا بلکہ فیض صاحب کے کاموں کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ جب الحمرا کا چرچا عام ہوا تو اربابِ اختیار کو اس میں اپنے فائدے کے پہلو نظر آنے لگے۔ اب تک یہ ہوتا

تھا کہ بیرونِ ملک سے ممتاز سرکاری مہمان لاہور آتے اور رقص و موسیقی یا مصوری کے نمونے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتے تو میزبانوں کو بڑی مشکل پیش آتی کیوں کہ شہر میں ایسا کوئی مرکز نہ تھا جس کی اُن کو سیر کروائی جاتی چنانچہ شاہِ ایران جب پہلی بار لاہور آئے تھے تو اُن کو پنجاب اسمبلی کے جھروکے میں بٹھا کر قوالی سنوائی گئی تھی۔ البتہ قوال حضرات نیچے سڑک پر بیٹھے تھے!

فیض صاحب کی اَن تھک محنت سے الحمرا اب اس قابل ہوگیا تھا کہ معزز سے معزز مہمان کو بھی وہاں مدعو کیا جاسکتا تھا لیکن ایک حلقے کو آرٹس کونسل کی یہ شہرت اور مقبولیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اُن کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں لاہور کے نوجوان فنکاروں پر فیض صاحب کا جادو نہ چل جائے اور وہ بھی سوشلسٹ کمیونسٹ ہوجائیں۔ فیض صاحب اس گروہ کے اخباری شور و غوغا کو خاطر میں نہ لاتے تھے مگر جنرل ایوب خان کے دربارِ اکبری میں کئی عبدالرحیم خان خاناں بھی تھے جو خود کو ادب و فن کا سب سے بڑا سرپرست خیال کرتے تھے۔ انہوں نے ادیبوں کو حکومت کا وظیفہ خوار بنانے کے لیے رائٹرز گلڈ قائم کرلی تھی اور اس فکر میں تھے کہ لاہور، کراچی اور ڈھاکہ کی آرٹس کونسل کو بھی خالص سرکاری ادارہ بنالیا جائے۔ فیض صاحب کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ سرکاری مداخلت کی وجہ سے اُن کو اپنے منصوبوں کا رنگین محل گرتا نظر آرہا تھا اور وہ بہت متفکر تھے۔ اسی اثنا میں حکومت کی طرف سے پشاور، راولپنڈی، کراچی اور لاہور کی آرٹس کونسل کے سربراہوں کا ایک اجلاس ڈھاکے میں طلب کیا گیا۔ فیض صاحب اس اجلاس کے مقصد سے بخوبی واقف تھے پھر بھی وہ اجلاس میں شریک ہوئے لیکن واپس آتے ہی ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ تین ماہ تک بستر پر پڑے رہے۔ اُنہوں نے آرٹس کونسل سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ جس آرٹس کو انہوں نے دو سال تک دن رات ایک کرکے پروان چڑھایا تھا اُس سے جُدا ہوتے وقت اُن پر جو گزری ہوگی وہ شاید اُن کے اس شعر سے

واضح ہوتی ہے کہ ۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

اُنہیں دنوں فیض صاحب کو لینن کا ادب انعام ملا اور وہ اپنی بڑی بیٹی سلیمہ کو ساتھ لے کر ماسکو چلے گئے۔

آرٹس کونسل سے وابستگی کے زمانے میں فیض صاحب اتنے مصروف رہے کہ اُن کو لیلائے سخن کے گیسو سنوارنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ اُس دور کی یادگار شاید ایک نظم 'کہاں جاؤ گے' اور ایک غزل ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم کا قول تھا کہ جو کام تمہارے سپرد ہو اُس کو اس تندہی سے کرو کہ تمہارے بعد وہ جگہ کبھی پُر نہ ہوسکے۔ فیض صاحب تمام عُمر اس اصول پر کاربند رہے۔ انہوں نے جو کام اپنے ذمّے لیا اُس کو اس خوبی سے، اس شوق و انہماک سے پُورا کیا کہ اُن کی جگہ واقعی کبھی پُر نہ ہوئی۔

لینن انعام لینے کے بعد فیض صاحب نے لندن میں مستقل سکونت اختیار کرلی کیوں کہ ایوبی مارشل لاء میں آزادی سے لکھنے بولنے کی اجازت نہیں تھی اور حصولِ معاش کے سب دروازے بھی بند تھے۔ مسز فیض بھی چھوٹی بیٹی منیزہ کو ساتھ لے کر لندن چلی گئیں۔ اُن کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہاں رہ کر دونوں بچیوں کی تعلیم مکمل ہوجائے گی مگر فیض صاحب جس مٹّی سے بنے تھے وہ اُن کو جہاں بھی رہے، ستاتی رہی۔ وہ پاکستان کے حالات سے بیزار رہے لیکن وطن سے اُن کی محبت اسی نسبت سے بڑھتی گئی، جس نسبت سے ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ لندن میں اُن کے پرستاروں اور ناز برداروں کی کمی نہ تھی مگر وہ تو خود پانی سے نکلی ہوئی مچھلی تھے، اجنبی دیس کے بن بلائے باسی۔ وہ فیض صاحب کی خاطر تواضع تو کرسکتے تھے اور انہوں نے خوب کی مگر ان کی چارہ سازی اور غمگساری کی فرصت کس کو تھی۔ لندن میں رہ کر اُن کو وطن بہت یاد آتا تھا۔

لاہور جو کبھی روشنیوں کا شہر تھا، اب شہرِ یاراں تھا، شہرِ یاراں جہاں یہ عالم تھا کہ

شہرِ یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف

شہرِ یاراں، جہاں 'ماتمی تاروں کی صف' بچھی ہوئی ہے اور اہرمن کے طبل و دف چنگھاڑتے ہیں، شاعر کو اسی دیس کی یاد تڑپاتی ہے۔

جا کے کہنا اے صبا بعد از سلامِ دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف

اور شاعر کی دُعا ہے کہ

مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر

وطن کی محبت کس کس طرح تڑپاتی ہے اور اس کی یادیں کس کس طرح بے چین کرتی ہیں اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دیارِ غیر میں پردیسیوں کی مانند رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نسل اور رنگ کی تفریق، زبان اور تہذیب کا فرق قدم قدم پر نشتر چبھوتا ہے اور آرام و آسائش کی تمام سہولتوں کے باوجود۔

لندن کی آزاد فضا سب کو اچھی لگتی ہے۔ جو چاہو لکھو، جو چاہو بولو، جہاں جی چاہے جاؤ اور جس سے جی چاہے ملو۔ جسم و جاں کی آزادی فقط محسوس کرنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اُس کو استعمال میں بھی لانا پڑتا ہے۔ فیض صاحب وہاں کوئی ملازمت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کُل وقتی یا پیشہ ور شاعر بھی نہ تھے کہ دن رات تصورِ جاناں میں تخیل کے جام و سبو لنڈھاتے رہتے۔ اُن کا مزاج تخلیقی تھا تحقیقی نہ تھا کہ کارل مارکس یا ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم کی طرح صبح سے شام تک برٹش میوزیم کی لائبریری میں بیٹھے کتابیں پڑھتے اور بیاضیں بھرتے رہتے۔ دوست احباب دن میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے — بچیاں اسکول اور مسز فیض کام پر چلی جاتیں، تب فیض صاحب کے لیے صبح کا

شام کرنا دوبھر ہو جاتا۔ اس تنہائی میں اُن کو وطن کی صحبتیں یقیناً بہت یاد آتی ہوں گی۔ یہ وطن کی محبت بھی بڑی جان لیوا شے ہوتی ہے، کہیں رہو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ گوشت پوست کی محبوبہ سے مفارقت پر چار و ناچار صبر آ جاتا ہے لیکن وطن کی محبت رہ رہ کر دل میں کانٹے چبھوتی اور تڑپاتی ہے اور جب کوئی مشغلہ، کوئی کام نہ ہو جس سے جی بہلے تو نالہ و شیون کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ فیض صاحب نے لندن کے دو سال اسی ذہنی اور جذباتی اذیت میں گزارے۔

وطن سے جو خبریں جاتی تھیں اُن سے بھی دل کی کلی کھلنے کی اُمید نہ تھی، وہی ہنگامۂ دار و گیر، وہی نطق و لب کی بخیہ گیری، اہلِ ہوس کی وہی ریشہ دوانیاں، اپنی بے بال و پری کا ماتم اور خاک بسر خانماں خرابوں کی خیر و عافیت کی دُعا۔

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر

رہِ یقیں تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر

مگر اُن کی دلی آرزو یہی تھی کہ امانتِ غم کی اس دولت سے ہم کبھی محروم نہ ہونے پائیں۔ حق و باطل کی جنگ میں ہمارے قدم کبھی راہ کو پُرخار دیکھ کر لرز نہ اُٹھیں، ڈگمگا نہ جائیں ؎

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پاسگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہرگام بہت دربدری نے

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشک بُو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دِل رُبا کے نام پہ خالی سبُو کریں

مگر بیگانگی اور تنہائی کا یہ شدید احساس فیضؔ صاحب کو سوویت یونین میں کبھی نہیں ہوا حالاں کہ وہاں اُن کے ہم زبان بہت ہی کم تھے، لیکن محبت زبان سے نہیں دل سے کی جاتی ہے اور دِل ملے ہوں تو یارِ مہرباں کی زبان ترکی ہو یا تازی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہاں فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری کی بڑی قدر و منزلت تھی اور وہاں کے سخنور اور دانشور اُن کے لیے آنکھیں بچھاتے تھے لہٰذا فیضؔ صاحب کو سوویت یونین میں اجنبیت یا غریب الوطنی کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ فیض صاحب نے جو نظمیں یا غزلیں وہاں کہیں اُن میں اُلفت اور قربت کی سرخوشی ہے ۔

تُم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر راہ گزر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اَب شیشۂ مے، راہ گزر، رنگِ فلک

اَب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اِک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر راہ گزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

اسی وقت کی دوسری نظم 'تم مرے پاس رہو' میں پہلی نظم کے حسی تجربے کا وہی تسلسل مِلتا ہے۔

ماسکو میں سینۂ ماہتاب کی تابانی دیکھ کر شاعر کو یہ محسوس ہوتا ہے 'جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ'

بڑا رومانوی منظر ہے۔ چاندنی رات، دیواروں کے سائے، پتّوں کے حباب، اور ہلکا خنک رنگ شراب اور شیشۂ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب، اس کیف آگیں ماحول میں ۔

دِل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، 'آہستہ'
چاند نے جھک کے کہا
'اور ذرا آہستہ'

۱۹۶۴ء میں ہارون کالج کراچی کے منتظمین نے فیضؔ صاحب کو کالج کی پرنسپلی پیش کی جس کو فیض صاحب نے خوشی سے قبول کرلیا۔ وہ دشت نوردی سے تنگ آچکے تھے اور وطن کی کشش ان کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ خوش قسمتی سے اُنہی دنوں وہ ۱۹۶۴ء کے وسط میں کراچی آگئے۔

کسی مضطرب روح کو سکون تو صرف قبر ہی میں مِل سکتا ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ لندن کی تنہا اور بے مقصد زندگی کے بعد کراچی بسا غنیمت جگہ تھی۔ یہاں اُن کے شب و روز بہت خوش گوار گزرے۔ اس جگہ اُن کا جی خوب لگا۔ ہارون کالج کھدا کے نہایت پسماندہ علاقے میں واقع ہے۔ جس وقت فیضؔ صاحب کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو کالج پر نزع کا عالم طاری تھا۔ ٹوٹی پھوٹی عمارت، بے سر و سامان کمرے، نادار بلوچ طلبا، جن کو فیس ادا کرنا تو بڑی بات تھی، دو روٹیوں کا سہارا بھی نہ تھا، نہ اُن میں تحصیلِ علم کا شوق، نہ اساتذہ میں تدریس کی لگن مگر فیضؔ صاحب نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی محنت اور محبت سے کالج کا نقشہ ہی بدل دیا۔

فیضؔ صاحب نے 'نقشِ فریادی' کے دنوں میں شاید کسی مخصوص لمحے میں یا کسی جذباتی حادثے سے متاثر ہوکر لکھا تھا کہ

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حُسنِ دو عالم سے
مگر دِل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فیض صاحب اُن خوش قسمت لوگوں میں تھے کہ اُن کو نہ کبھی زمانے کی ناقدر شناسی کی شکایت کا موقع مِلا، نہ اُن کو کبھی پرستاروں کی کمی محسوس ہوئی۔ اُن کا خانۂ دل ہمیشہ حُسنِ دو عالم کے خزینوں سے معمور رہا، بلکہ کراچی میں تو اُن کے چاہنے والے اُن کو چین سے بیٹھنے بھی نہ دیتے تھے۔ آخر تنگ آ کر مسز فیض نے حکم دے دیا کہ دن کے دو بجے اور پانچ بجے کے درمیان کوئی ملنے نہ آئے کہ وہ فیضؔ صاحب کے آرام کا وقت ہوتا تھا۔

کراچی کو یہ فخر حاصل ہے کہ 'بہر دادیٔ سینا' کا سارا کلام اسی شہر کی تخلیق ہے۔ ایوبی آمریت عروج پر تھی۔ بنیادی جمہوریت کا دَور تھا۔ ادیبوں، دانش وروں پر نوازشوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ۱۹۶۲ء کا نیا آئین نافذ ہو چکا تھا اسی کے تحت صدارتی انتخابات ہونے والے تھے اور حزبِ اختلاف کی جانب سے ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو اُمیدوار منتخب کیا گیا تھا۔ ایوب خان کا انتخابی نشان گلاب کا پھول تھا۔

فیض صاحب پر جب کبھی سرکارِ دربار کا سایہ پڑا تو اُن کی شاعری ضرور مجروح ہوئی۔ یہ درست کہ 'الحمرا' کو انہوں نے ملک کا نہایت اہم اور فعال ادارہ بنا دیا تھا اور ایسی روایت قائم کردی جو اَب تک زندہ ہے لیکن 'الحمرا' کے دَور میں ملکۂ سخن اُن سے کچھ روٹھی روٹھی سی رہی۔ یہی صورت دوبارہ ۱۹۷۲ء میں پیش آئی جب وہ وزارتِ تعلیم و تہذیب سے وابستہ ہوکر اسلام آباد میں اقامت پذیر ہوئے۔ فیضؔ صاحب کو مروجہ فنونِ لطیفہ کے علاوہ ملک کے لوک ورثے سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ اُن کی دِلی خواہش تھی کہ ادب و

فن کے اس عوامی ورثے کو جس قدر ممکن ہو محفوظ کرلیا جائے ورنہ یہ قیمتی سرمایہ مشینی مصنوعات کے سیلاب میں بہہ جائے گا اور کچھ عرصے کے بعد کسی کو اُن کے نام بھی یاد نہیں رہیں گے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ فیض صاحب اور ان کے رفقا نے گاؤں گاؤں گھوم کر لوک گیت اور لوک ساز جمع کیے۔ دیہاتی عورتوں کے زیوروں، کشیدہ کاریوں کے اور عام دستکاریوں کے نمونے بڑی محنت سے جمع کیے اور اسلام آباد میں لوک میوزیم قائم کر دیا مگر اس بار بھی کچھ مصروفیتوں کے باعث اور کچھ سیاسی مصلحتوں کے باعث فیضؔ صاحب پر خود احتسابی اور وضع احتیاط کا ایسا دورہ پڑا کہ شاعری کے برگ و بار مُرجھا گئے۔

زنداں زنداں شور انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

یہی پھول اس انداز سے ایک جگہ اور نظم ہوا ہے۔

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

ایوب خاں کو الیکشن جیتنا تھا سو وہ بھی جیت گئے مگر معاشرتی زندگی کے جس تضاد کی جانب فیضؔ صاحب نے اشارہ کیا تھا وہ ایوب خاں کو لے ڈوبا۔ فتح و نُصرت کے شادیانے بج رہے کہ ایک مقرّب خاص نے اُن کو بوٹی سنگھائی کو جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد اَب کشمیر پر قبضہ کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ وادی کے مسلمان پاکستان سے الحاق کے لیے بے چین ہیں۔ وہاں اگر قبائلی رضاکار بھیج دیے جائیں تو مقبوضہ کشمیر الجزائر بن جائے گا اور ہندوستانی فوج کچھ نہ کرسکے گی۔ ایوب خان کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ

ہندوستان جوابی کارروائی میں پاکستانی سرحد عبور کرنے کی جرأت نہ کرے گا لیکن کشمیریوں نے بغاوت کرنے کے بجائے قبائلی رضا کاروں کو پکڑ پکڑ کر ہندوستانی فوج کے حوالے کر دیا۔ دوسری طرف ہندوستانی فوجیں واہگہ کی سرحد پار کر کے لاہور کے قریب آ گئیں اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ہندوستان، پاکستان کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اتنی فضول اور بے مقصد جنگ شاید ہی کبھی لڑی گئی ہوگی۔ اس جنگ سے نہ صرف ایوب خان کی ہوا اُکھڑ گئی بلکہ پاکستان کو شدید جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

اسی 'پھول' کی آڑ لے کر فیضؔ صاحب نے وہ نظم لکھی جس کا عنوان 'یہاں سے شہر کو دیکھو' ہے۔

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا، یہ پھول ہیں کہ لہو

اور جب یہ جنگ چھنڑی اور شہر نے بلیک آؤٹ کی سیاہ چادر اوڑھ لی تو شاعر کو یوں محسوس ہوا کہ

جب سے بے نور ہوئی ہیں شمعیں
خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا
کھو گئی ہیں میری دونوں آنکھیں

مگر شاعر کی آنکھیں نہیں کھو گئی تھیں بلکہ اُن اربابِ حل و عقد کی آنکھوں پر ناعاقبت اندیشی کے پردے پڑ گئے تھے جو 'اُس پار کس دنیا سے'، 'برق طور'، 'ید بیضا' کے

معجزوں کی آس لگائے بیٹھے رہے لیکن تمام جھوٹے پروپیگنڈوں کے باوصف کسی نے مدد نہ کی۔

ایسی لغو اور مہمل جنگ کی رجز خوانی وہی شخص کر سکتا تھا جس نے اپنی عقل و فہم کو احمقوں کے حوالے کر دیا ہو۔ اس نام نہاد سترہ روزہ جنگ کے زمانے کا لٹریچر یکجا کر کے اگر خود اُن ادیبوں، دانش وروں کے سامنے رکھ دیا جائے جو اس لٹریچر کے خالق تھے تو اُن کی گردنیں بھی شرم سے جھک جائیں گی مگر اس وقت تو اہلِ خرد پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ کوئی سنجیدگی سے سوچنے یا گفتگو کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ مفاد پرست اخبار گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے اور فیضؔ صاحب سے حب الوطنی کا دستاویزی ثبوت طلب کیا جا رہا تھا مگر فیضؔ صاحب کا مسلک کپلنگ کا مسلک نہ تھا کہ وطن کے حکمران اپنے ذاتی اغراض کی خاطر اگر وطن کو آگ میں جھونک دیں تو اُن کو شاباشی دی جائے، البتہ فیضؔ صاحب کو اس کا غم ضرور تھا کہ ہمارے اچھے اچھے ہونہار جوانوں کی جانیں مفت میں ضائع گئیں اور انہوں نے بڑے دکھ بھرے دل سے 'سپاہی کا مرثیہ' لکھا، وہ بھی جنگ کے خاتمے کے بعد۔

فیضؔ صاحب کے دلدار یوں تو ہر شہر اور ملک میں تھے مگر کراچی میں ان کو دو شخصیتیں بہت عزیز تھیں۔ ایک بیگم آمنہ مجید ملک اور دوسری ڈاکٹر شوکت ہارون۔ دونوں سے اُن کی ملاقات اُس زمانے کی تھی جب وہ دہلی میں مقیم تھے۔ یہ وہ دلنواز ہستیاں تھیں جن کی چادرِ تطہیر کو بقول ریاض خیرآبادی ؎

رفو کرنے کو تار دامنِ مریم نکلتا ہے

آمنہ باجی کی باغ و بہار شخصیت اور اُن کی دردمندی کا ہر شخص معترف ہے۔ وہ فیض صاحب سے اپنے سگے بھائی کی طرح محبت کرتی تھیں اور فیضؔ صاحب کو اُن کے گھر میں جو آرام سکون ملتا تھا وہ کہیں نہ ملتا تھا۔ آمنہ باجی ان نڈر خواتین میں ہیں جن پر

سیاسی مصلحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ فیضؔ صاحب جیل میں ہوتے تب بھی وہ بے خوف و خطر ان سے ملنے پہنچ جاتیں۔ ہر چند کہ فیضؔ صاحب کے سیاسی خیالات سے اُن کو چنداں دلچسپی نہ تھی مگر اُن کو دوست کی دوستی سے کام تھا اُس کی 'حرکتوں' سے نہیں۔ ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء نافذ ہوا اور فیضؔ صاحب لاہور جیل میں تھے، پہلی جنوری کی صبح تھی کہ خبر ملی کہ فیضؔ صاحب کی ملاقات آئی ہے۔ فیضؔ صاحب حیران تھے کہ آج ایلس اور بچوں کے آنے کا دن بھی نہیں، پھر یہ کون آیا ہے۔ فیضؔ صاحب گھنٹہ بھر کے بعد لوٹے تو ایک قیدی پھلوں کا بڑا سا ٹوکرا لیے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا کہنے لگے آمنہ باجی کراچی سے آئی تھیں۔ حالاں کہ نظر بندوں سے فقط اُن کے قریبی عزیز — باپ، ماں اور بیوی بچے — ہی مل سکتے تھے لیکن آمنہ باجی ان قاعدے قانونوں کی کب پروا کرتی ہیں۔ اُن کی شخصیت اور بے لوث خدمت کا رُعب اتنا ہے کہ بڑے سے بڑا افسر بھی اُن کی خواہش کو رد کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ فیض صاحب کے دوستوں عزیزوں میں مسز فیض کے علاوہ اب اُن کی واحد ذات ہے جو فیضؔ صاحب کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعے اور اُن کے مزاج کے ہر رنگ سے اتنا ہی واقف ہیں جتنا خود فیض صاحب واقف تھے۔ کاش وہ اپنے تجربات اور تاثرات قلمبند کر دیتیں۔

'زنداں نامہ' کی نظم 'اے حبیب عنبر دست' سے شاعر کی مراد ڈاکٹر شوکت ہارون تھیں۔ وہ خوشبو کا تحفہ وصول کرنے پر اجنبی خاتون کا شکریہ بڑی محبت سے ادا کرتے ہیں لیکن اسی بہانے اپنا فلسفۂ محبت بھی بیان کر دیتے ہیں ؎

لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

اس شاخ مہر و وفا کو ڈاکٹر شوکت ہارون نے مرتے دم تک سرسبز رکھا۔

وہ اُن کی رئیسانہ شان و شوکت، وہ اُن کی انتہائی باوقار شخصیت، وہ اُن کی فراخ دِلی اور گرم جوشی اور پھر اُن کے مزاج کی نرمی اور سادگی۔ لیڈی میک لی گن زنانہ اسپتال کی سربراہ تھیں جہاں اسپتال کا عملہ اور مریض اُن کے حُسن اخلاق اور فرض شناسی کا دَم بھرتے تھے۔ غریب مریضوں پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں۔ روپے پیسے کا اُن کو لالچ نہ تھا بلکہ اُن کے پرائیویٹ مطب میں زیادہ تر وہی عورتیں جاتی تھیں جن کو ڈاکٹر صاحبہ دوائیں بھی اپنی جیب سے فراہم کرتی تھیں۔

فیضؔ صاحب جولائی ۱۹۵۳ء میں جن دنوں جناح اسپتال میں زیر علاج تھے تو آمنہ باجی کے علاوہ ڈاکٹر شوکت ہارون نے ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال بڑی تن دہی سے کی اور زندانی شاعر پر جو لطف و عنایت کی، اُس کی گواہ 'زنداں نامہ' کی غزلیں ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ اگست ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر شوکت اچانک انتقال کر گئیں۔ وہ یورپ گئی ہوئی تھیں، صبح کو کراچی واپس آئیں۔ سارا دن اپنی والدہ (لیڈی عبداللہ ہارون) کے ساتھ گزارا، گھر لوٹیں، دِل کا دورہ پڑا اور آناً فاناً وفات پا گئیں۔ فیضؔ صاحب سوءِ اتفاق سے لاہور گئے ہوئے تھے، ان کی موت کا صدمہ، دوسرے روز جنازہ اُٹھا تو فیضؔ صاحب ضبطِ غم سے اُن کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، مگر زبان سے انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا، بس سارے راستے سگریٹ سے سگریٹ جلاتے رہے۔ ستم یہ ہوا کہ ڈاکٹر شوکت کو ہارون کالج سے ملحق آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

'سرِ وادیٔ سینا' کے دونوں مرثیے فیضؔ صاحب کے سیاسی مرثیوں سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں خالص غم ذات ہے ؎

دُور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے

اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے

دوسری غزل ڈاکٹر شوکت ہارون کی شخصیت کا سراپا ہے اور جن لوگوں نے اُن کو دیکھا تھا وہ گواہی دیں گے کہ فیضؔ صاحب نے مبالغے سے بالکل کام نہیں لیا ہے۔ البتہ تیسری غزل آپ بیتی ہے، دوست کی ابدی جُدائی کا جو قلق ہے ؎

کب تک دل کی خیر منائیں کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے
بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

یہ نوحہ نما غزل، یہ طرزِ آہ و فغاں، اس پر تو میرؔ صاحب بھی رشک کرتے۔

ابھی فیضؔ صاحب کا یہ زخمِ دل بھرا نہ تھا کہ ملک ایک بار پھر سیاسی بحران میں گرفتار ہوگیا۔ جنرل ایوب خان 'عشرۂ ترقی' سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ اُن کے سابق وزیرِ خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اُن کے خلاف شورش شروع کردی۔ اس تحریک کی تاب نہ لاکر اُنھوں نے عنانِ اختیار اپنے سپہ سالار، فوج جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دی اور مستعفی ہوگئے۔ جنرل یحییٰ خاں نے ایک یونٹ کو توڑنے اور 'ایک شخص ایک ووٹ' کے اصول پر عام انتخابات کرنے کا اعلان کردیا۔ جنرل یحییٰ خان کی گذشتہ پندرہ برس سے مسلسل کردار کشی ہو رہی ہے جو بڑی حد تک درست ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ پاکستان کی تاریخ میں لوگوں کو پہلی اور آخری بار جو شہری آزادی ۱۹۷۰ء میں انتخابات سے پہلے اور بعد میں نصیب ہوئی وہ کبھی نہیں ملی ؎

دریدہ دل ہے کوئی شہر میں ہماری طرح
کوئی دریدہ دہن شیخِ شہر کی مانند

اور وہ پہلے اور آخری عام انتخابات تھے جن میں انتظامیہ اور فوج دونوں غیر جانبدار رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی بنگال جو آبادی کے اعتبار سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی مشترکہ آبادی سے بھی زیادہ تھا، کے نمائندوں کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوئی اور اس کا امکان پیدا ہوا کہ حق بہ حقدار رسید۔

اسی موہوم سی اُمید میں فیضؔ صاحب نے کہا تھا کہ

خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھیے
بہارِ گل میں جو پہنچے ہیں شاخِ گل کو گزند

مگر نہ افسر شاہی اور فوج ڈھاکے کی قیادت کو برداشت کرسکتی تھی نہ مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت کو پچھلی صف میں بیٹھنا گوارا تھا، چنانچہ گفت و شنید سے مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی ؎

شرحِ بیدردیٔ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی
پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا!
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

معرکۂ فلسطین کے علاوہ فیضؔ صاحب پر شاید ہی کسی خونیں حادثے سے اتنے

فیضؔ صاحب اور مشرقی بنگال

مشرقی بنگال میں فوج کے ہاتھوں قتلِ عام کا جو میلہ سجا اُس سے فیضؔ صاحب کو بہت صدمہ پہنچا۔ مشرقی بنگال کی ساتھ ابتدا ہی سے نوآبادیوں کا سا جو سلوک کیا جاتا تھا وہ اس ناانصافی پر ہمیشہ کڑھا کرتے تھا اور وہاں کی اکثریت کو اُس کے جائز حقوق سے محروم کرنے کی غرض سے جو شاطرانہ چالیں چلی جاتی تھیں، فیضؔ صاحب نے 'پاکستان ٹائمز' اور 'لیل ونہار' میں اُن کی برابر مذمت کی۔ وہ مشرقی بنگال اکثر جاتے رہتے تھے اور وہاں کی زبوں حالی کے عینی شاہد تھے۔ اُن کو بنگال کے قدرتی مناظر، وہاں کے ناچ گانے، ادب اور شاعری، مصوری اور لوک آرٹ بہت پسند تھے اور وہاں کے سبھی ادیب، صحافی، فن کار، فلم ساز، حتیٰ کہ سیاسی لیڈر بھی فیضؔ صاحب کو اپنا سچا دوست سمجھتے تھے اور اُن کا بیحد احترام کرتے تھے۔ اب جو محشر دار وگیر برپا ہوا تو اُن کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی اور انہوں نے مشرقی بنگال کے خونیں حادثوں سے متاثر ہوکر نو دس نظمیں اور غزلیں کہیں۔

پہلی نظم 'شرحِ بیدردیٔ حالات نہ ہونے پائی' مصالحتی گفتگوؤں کی ناکامی پر کہی گئی۔ دوسری نظم 'حذر کرو مرے تن سے' ظلم وتشدد کے آغاز پر کہی گئی۔ تیسری نظم جو ابتداء تا انتہا لہو رنگ ہے، اُس وقت کہی گئی جب مشرقی بنگال میں خون برسنے لگا۔

خورشید کا کندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو
ہر شجر مینارِ خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے
ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے

فیضؔ صاحب نے لاکھ سمجھایا کہ ناعاقبت اندیشو، جس موج خوں سے تم کھیل رہے ہو اُس کے انجام سے ڈرو کیوں کہ 'غیض وغم' کا رنگ اگر تھم جائے تو نفرت کا، شب کا، موت کا، ہر رنگ کے ماتم کا رنگ بن جاتا ہے ؎

چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
آبِ وضو
جس میں ڈھل جائیں تو شاید ڈھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

مگر جن کے سر پر خون سوار تھا اُن کی آنکھوں میں محبت اور ندامت کے آنسو کہاں سے آتے، بالآخر 'شمشیر شناسائی' دل میں ٹوٹی اور 'یار اغیار ہوگئے'۔ مشرقی بنگال، بنگلہ دیش بن گیا مگر فیضؔ صاحب اُس کی یاد میں آنسو بہاتے رہے اور اپنے نغمۂ بے صدا کو درد کی دُھن میں گاتے رہے۔

اُن رشتوں کے جو چھوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اک اک کرکے ٹوٹ گئے

مگر فیضؔ صاحب مایوس نہ تھے۔ اُن کو دور دیس والوں سے اب بھی محبت کے پیغام آتے تھے۔

•

وہ کہتے تھے، کیوں قحطِ وفا کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو

اور دو تین سال بعد جب حالات سازگار ہوتے نظر آئے تو شاعر نے 'شامِ شہریاراں' لکھی۔

اے شامِ شہریاراں
ہم پہ مہرباں ہو

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے
کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے

مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے

چلو پھر سے مُسکرائیں
چلو پھر سے دِل جلائیں
جو گزر گئی ہیں راتیں
اُنہیں پھر جگا کے لائیں
جو بسر گئی ہیں باتیں
اُنہیں یاد میں بلائیں

چلو پھر سے دِل لگائیں
چلو پھر سے مسکرائیں

مگر مسکرانا، پھر سے دل لگانا اور مسکرانا اتنا آسان نہ تھا۔ ایک موتی ٹوٹ جائے تو اُس کے عوض لال و گہر کی تھیلیاں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن دِل ٹوٹ جائے تو اس کا مداوا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پاکستان نے بنگلہ دیش کو مجبوراً تسلیم کرلیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں مدعو کیا گیا اور اُن کی بڑی آؤ بھگت بھی ہوئی مگر دِل کی کدورتیں نہ گئیں۔ بھٹو صاحب خیر سگالی کے دورے پر ڈھاکے گئے اور فیضؔ صاحب کو بھی لیتے گئے لیکن بات نہ بنی۔ واپس آئے تو بہت آزردہ تھے۔ کہنے لگے کہ ہم تو بڑے شوق سے گئے تھے کہ سب یار آشناؤں سے ملاقات ہوگی مگر سارا وقت ہوٹل میں بند رہے۔ ایک آدھ دوستوں سے ملنا ہوا وہ بھی بڑی مشکلوں سے۔

دِل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گِلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

کئی برس بعد فیضؔ صاحب ایک شام لندن میں کہیں مہمان تھے۔ جسٹس عبدالستار بھی جو بعد میں بنگلہ دیش کے صدر ہوئے، وہاں موجود تھے۔ فیضؔ صاحب اپنی نظم 'ڈھاکے سے واپسی پر' سُنا رہے تھے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے کب

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خُون کے دھبّے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تو جسٹس عبدالستار بولے، فیضؔ صاحب! خُون کے دھبّے برساتوں سے نہیں دُھلا کرتے، فیض صاحب خاموش ہوگئے۔

حرفِ حق دِل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

فیضؔ صاحب اسلام آباد میں

فیضؔ صاحب سانحۂ بنگال سے اتنے بد دل ہوئے کہ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ملک سے باہر چلے جانے کا ارادہ کرلیا۔ اُس وقت پاکستان میں پیپلز پارٹی برسرِاقتدار آ چکی تھی۔ فیضؔ صاحب نے جب اپنی خواہش کا اظہار بھٹو صاحب سے کیا تو انہوں نے کہا فیضؔ صاحب باہر کہاں جایئے گا، یہاں ڈھیروں کام پڑے ہیں۔ آپ کو تہذیبی کاموں کا شوق بھی ہے اور تجربہ بھی۔ یہ ذمے داری آپ قبول کرلیں۔ فیضؔ صاحب نے یہ پیشکش قبول کرلی، اور اسلام آباد میں نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے ڈائریکٹر بن گئے۔

وہ صدقِ دل سے یہ سمجھتے تھے کہ عوامی حکومت کے راج میں وہ پاکستانی تہذیب و فن کی جی بھر کر خدمت کرسکیں گے لیکن افسر شاہی کے آگے اُن کی ایک پیش نہ گئی۔ خود احتسابی الگ عذاب بن گئی، نہ کُھل کر شعر کہہ سکتے تھے، نہ آزادی سے کام کرسکتے تھے۔ جو پانچ سال انہوں نے حکومت کے ساتھ گزارے وہ اُن کی شاعری کی حد تک بڑے بے ثمر سال تھے۔ خود اُن کو احساس تھا مگر دامن تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے، والی بات تھی۔

اسلام آباد کی فضا محلاتی سازشوں کے لیے نہایت موزوں ہے مگر یہ وہ سرد خانہ

ہے جس میں داخل ہوکر انسان کے ضمیر پر، اس کی روح پر، اُس کے دل و دماغ اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر برف کی تہیں جم جاتی ہیں۔ فیضؔ صاحب جب کبھی کراچی آتے تو ان کی باتوں سے اندازہ ہوجاتا کہ وہ وہاں ذہنی طور پر کتنے ناآسودہ ہیں۔ شکوہ، شکایت ان کی عادت نہ تھی لیکن صاف نظر آتا تھا کہ وہ ایک دلدل میں پھنس گئے ہیں مگر وہ اس سے نکلنے کی راہ نہیں پاتے۔ افسر شاہی اُن سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی مگر قدم قدم پر ان کے کام میں روڑے اٹکاتی اور فیضؔ صاحب کا بہت سا وقت سرکاری دفتروں کا چکر کاٹنے میں گزرتا۔ خود احتسابی الگ عذابِ جان تھی، نہ کُھل کر شعر کہہ سکتے تھے، نہ کُھل کر بول سکتے تھے۔ چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ ملک کے اندر رہ کر وہ ڈھنگ کی کوئی نظم یا غزل نہ لکھ سکے اور جو لکھا وہ بڑی بیدلی سے۔ خود اُن کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کی شاعری مجروح ہورہی ہے۔

فیضؔ صاحب کی زندگی کے وہ چار پانچ سال جو انہوں نے اسلام آباد میں گزارے وہ شعری تخلیق کے اعتبار سے بالکل اکارت گئے۔ یوں تو وہاں اُن کو ہر طرح کا آرام نصیب تھا۔ سرکار دربار تک رسائی تھی، دعوتیں اور ضیافتیں تھیں۔ مہ وشوں کی جلوہ پاشیاں تھیں اور کاسہ لیسوں کا ہجوم تھا لیکن اسلام آباد ۱۸ ویں صدی کا وائمر تھا نہ فیض صاحب گوئٹے، کہ جہاں نوابی ماحول میں دن رات تھیٹر، اوپیرا کے چرچے ہوتے، رقص و سرور کی محفلیں جمتیں، جرمنی کے ادیبوں، شاعروں کو بہرحال سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اسلام آباد کے پرنس اور اس کے مصاحبوں کے مشاغل وائمر کے پرنس سے مختلف تھے۔

اُن کو وہاں ہر وقت اپنے ضمیر سے لڑنا پڑتا تھا اور روحانی اذیتیں برداشت کرنی پڑتیں۔ جیل میں تمام پابندیوں کے باوجود اُن کی فکر آزاد تھی، اُن کی نطق و لب آزاد تھے، اُن کا آدرش اُن کو روحانی غذا فراہم کرتا تھا اور اُن کو کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور حق گوئی کی پاداش میں سزا بھگت رہے ہیں۔ اُن کو یہ بھی سہارا اور اطمینان تھا کہ اس

جہادِ زندگانی میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ جیل کے اندر اور باہر ہزاروں لاکھوں اُن کے ہم نوا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شعری زندگی کے بھی وہی چار سال سب سے بارآور ثابت ہوئے۔ اس کے برعکس انہوں نے اسلام آباد میں جو چار سال گزارے وہ نہ صرف اکارت گئے بلکہ اس سے اُن کی شخصیت اور عزتِ نفس بہت مجروح ہوئی۔ اُن کو ہر وقت اپنے ضمیر سے جنگ کرنی پڑتی، مفاہمت کرنی پڑتی، سرکاری افسروں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے اور اُن کو یہ بھی احساس ستاتا تھا کہ وہ لوگ اُن کے حقیقی مداح اور اُن کے آدرش پر چلنے والے اُن کی سمجھوتہ بازی سے آزردہ ہیں۔ اُن کو یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے کلچر کی خدمت کی خواہش میں جو قدم اٹھایا، وہ غلط تھا۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ اس نے بڑھتے بڑھتے نفرینِ ذات کی صورت اختیار کر لی حالاں کہ اس سے پہلے اُن کو اپنی ذات سے ناراض ہونے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ بعد میں۔ ایک پوری غزل اُن کے کرب و درد کی ترجمانی کرتی ہے ۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعداء جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دِل میں تمام ہوتی رہی

جو کچھ بھی بَن نہ پڑا، فیضؔ لُٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دُعا و سلام ہوتی رہی

'رہزنوں سے دُعا و سلام' کی طرح خود انہوں نے اپنی مرضی سے ڈالی تھی اور یہی خواہوں کے مشورے کے خلاف اور اب فیضؔ صاحب پچھتا رہے تھے کہ

وہ حیلہ گر جو وفا جُو بھی ہے جفا خُو بھی
کیا بھی فیضؔ تو کس بُت سے دوستانہ کیا

الفرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم اور مجاہدین فلسطین کا ہماری شاعری پر بڑا احسان ہے جنہوں نے فیضؔ صاحب کو اس دلدل سے نکالا اور فیضؔ صاحب ۱۹۷۷ء کے اواخر میں 'لوٹس' کے ایڈیٹر ہو کر بیروت چلے گئے۔

اسلام آباد کے دوست نما دشمنوں نے فیضؔ صاحب کی تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہ سوویت یونین گئے ہوئے تھے کہ اُن کی عدم موجودگی میں اُن کو 'نیشنل کونسل آف دی آرٹس' کی سربراہی سے ہٹا کر 'مشیرِ تعلیم' بنا دیا گیا۔ سازشیوں میں، وہ صاحب پیش پیش تھے جن کو فیضؔ صاحب خود بڑے ارمانوں سے کراچی سے لائے تھے، وہی صاحب نئے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یاروں نے فیضؔ صاحب کی واپسی کا انتظار بھی نہ کیا۔ اشک شوئی کے لیے اُن کو 'مشیرِ تعلیم' بنا کر لاہور بھیج دیا گیا۔ فیضؔ صاحب رواقیوں کی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ بھئی اب کام دھیلے کا نہیں، بس یوں سمجھ لو کہ پنشن ملتی ہے۔ اُس وقت کی ذہنی کیفیت کو 'درآمید کے دریوزہ گر' میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

پھر پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

مگر فیضؔ صاحب کی عالی ظرفی دیکھیے کہ جولائی ۱۹۷۷ء میں جب 'دردمند عشق' پر ٹھپے لگانے والے کرسیٔ اقتدار سے محروم ہوئے تو فیضؔ صاحب نے اس کو ملک کا المیہ قرار دیا ۔

آج ہر سُر سے ہر اک راگ کا ناتا ٹوٹا

اُن کو یہ غم بھی ہے کہ جس کو جان و تن کی حفاظت کا فریضہ سونپا تھا اُسی نے

وفاداری کے تمام عہد و پیمان فراموش کر دیے اور شب خون مارا۔

پوچھو تو اِدھر تیر فگن کون ہے یارو
سونپا تھا جسے کام نگہبانیٔ دِل کا

اور وہ جو دن رات اللہ رسولؐ کا نام لیتے نہ تھکتے تھے، خود خدائی کے دعویدار بن گئے۔ انہوں نے خُدا کا خوف اور روزِ جزا کا خیال دِل سے نکال دیا ؎

وہ بُتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دِلوں سے خوفِ خدا گیا

خُدا، رسُول کی اطاعت کی باتیں کرنے والے خود خُدائی کے دعوے دار بن گئے۔

حیراں ہے جبیں آج کِدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند سرِ عرشِ خُدا ہے

فیضؔ صاحب سوویت یونین میں

فیضؔ صاحب ایفروایشیائی ادیبوں کی افتتاحی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سوویت یونین پہلی بار ۱۹۵۸ء میں گئے تھے۔ یہ کانفرنس جمہوریہ ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں منعقد ہوئی تھی۔ فیضؔ صاحب نے اس کانفرنس کے بحث مباحثوں میں جو مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا اُس سے کانفرنس کے منتظمین اور دوسرے ادیب بے حد متاثر ہوئے۔ کانفرنس کے اختتام پر جو اعلان نامہ اتفاقِ رائے سے منظور ہوا اُس کا متن فیضؔ صاحب ہی نے تیار کیا تھا[1]۔ اُس وقت سے وفات تک اُن کو متعدد بار سوویت یونین جانے کا اتفاق ہوا اور وہ جہاں بھی گئے اُن کی پذیرائی بڑی گرم جوشی سے ہوئی۔ اُنہوں نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کا ذکر اپنی مختصر سی تصنیف 'مہ و سال آشنائی' میں کیا ہے۔ یہ کتاب فیضؔ صاحب نے ماسکو کے کسی اسپتال میں لیٹے لیٹے قلم بند کی تھی۔ سوویت یونین کے کئی ممتاز ادیبوں — رسول حمزہ، مرزا ترسوم زادہ، تخونوف، موسیٰ ایبک وغیرہ — سے اُن کی ذاتی دوستی تھی۔ اُن کے کلام کے کئی ترجمے روسی، اُزبیک، تاجیک، ترکی اور دوسری

---

[1] متاعِ لوح و قلم۔ از فیض احمد فیضؔ۔ ص ۳۱، کراچی ۱۹۷۳ء۔

زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئے ہیں اور سوویت یونین کا شاید ہی کوئی صاحبِ ذوق شہری ہو جو فیض احمد فیض کے نام سے واقف نہ ہو۔ ۱۹۶۲ء میں اُن کو 'لینن' کا بین الاقوامی امن انعام ملا۔

ہماری نئی نسل کو شاید معلوم نہ ہو کہ ۱۹۴۸ء میں جب سوویت یونین کی اپیل پر ہر ملک میں امن کمیٹیاں بننے لگیں تا کہ سامراجی طاقتوں کی جنگی تیاریوں کا سدِ باب کیا جائے تو فیض صاحب پاکستان کی مرکزی کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ آج کل تو وہ حکومتیں بھی امن، امن کہتے نہیں تھکتیں جو دن رات ایٹم بم، ایٹمی میزائل اور دوسرے ہلاکت آفریں ہتھیار بنانے میں مصروف ہیں مگر اس وقت سامراج نواز ملکوں میں امن کا نام لینا بھی جُرم تھا لیکن فیض صاحب نے افسر شاہی کے عتاب کی پرواہ نہ کی۔ وہ امن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور لاہور، اوکاڑہ، گوجرانوالہ، لائل پور، غرض یہ کہ جہاں کہیں امن کمیٹی کا جلسہ ہوتا، اُس میں تقریر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ سامراجی طاقتوں کی جنگی تیاریوں سے نہ صرف دنیا کا امن اور نوآزاد ملکوں کی آزادی ہی خطرے میں ہے بلکہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے بھی عالمی امن کتنا ضروری ہے۔ وہ ۱۹۵۱ء میں اپنی گرفتاری تک امن کی مہم میں پیش پیش رہے۔

ماسکو میں امن کا انعام وصول کرتے وقت انہوں نے اُردو میں جو تقریر کی وہ دُنیا کے سبھی ادیبوں فنکاروں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

فیض صاحب سوشلسٹ معاشرے میں رہ کر بڑی روحانی مسرت محسوس کرتے تھے اور بہت خوش رہتے تھے کیوں کہ اپنے وطن کے لیے جس سماجی نظام کا خواب وہ ہمیشہ دیکھا کرتے تھے وہ سوویت یونین میں حقیقت کی افشاں ملے شاعر کے دیدۂ و دِل کو سکون و فرحت کا سامان فراہم کرتا تھا۔ وہاں لوگوں نے جس خلوص اور محبت سے اُن کی آؤ بھگت کی اُس نے بھی فیض صاحب کا دِل موہ لیا۔

سوویت یونین میں دورانِ قیام انہوں نے مختلف اوقات میں بائیس ۲۲ نظمیں اور غزلیں کہیں۔ ان اشعار میں لندن یا بیروت کے زمانے کی تخلیقات کا سا بیگانگی اور تنہائی کا احساس نہیں ملتا، نہ غریب الوطنی کا ماتم ہے، نہ یار دوستوں سے دُوری کا غم ہے اور نہ زبانِ یارِ من تُرکی کا شکوہ ہے، بلکہ اشعار پر سرخوشی اور سرشاری کی کیفیت طاری نظر آتی ہے۔ انہوں نے سوویت یونین کے کئی شاعروں — رسول حمزہ، آندرے، وزنیس سکی، موسیٰ ایبک، ناظم حکمت، قاسن قلی، عمر علی سلیمان — کے کلام کے ترجمے بھی کیے۔

۱۹۶۳ء کی دونوں نظموں 'رنگ ہے دل کا مرے' اور 'پاس رہو' میں ہر چند کہ یادِ ایام کی تلخی ہنوز باقی ہے (شاید یہ نظمیں ماسکو کے اسپتال میں لکھی گئی تھیں) لیکن ان میں بھی مفارقت کا مرثیہ نہیں بلکہ قربت کی آرزومندی ہے جیسے کوئی دوست بیمار کی عیادت کو آیا ہو۔

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اِک بار ہر اِک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر راہ گزر، شیشہ مے شیشہ مے

فیض صاحب بیان کرتے تھے کہ سوویت یونین کے اسپتال یہاں کے اسپتالوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں تو کوئی شخص اوقاتِ ملاقات کی پابندی نہیں کرتا بلکہ بیمار سے ملنے والوں کا دن رات تانتا بندھا رہتا ہے مگر سوویت یونین میں کیا مجال جو خاندان کا قریب ترین فرد بھی بلا اجازت بیمار کے کمرے میں داخل ہو سکے۔ دن کے وقت تو ہر طرف چہل پہل رہتی تھی لیکن رات کے وقت مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایسے شخص پر جو قید خانے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی رات کے حُسن سے لطف اندوز ہونے کے پہلو نکال لیتا تھا۔

ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں بانہیں

اسپتال کے بند کمرے کی سنسان رات یقیناً بہت گراں گزرتی ہوں گی، تبھی تو فیض صاحب بڑی بے بسی سے التجا کرتے ہیں کہ

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے

اُن کی نظم 'اشک آباد کی شام' کی شانِ نزول بہت دلچسپ ہے۔ اُس کا پس منظر یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں یونیسکو کے زیرِ اہتمام ایک دس روزہ سیمینار جمہوریہ ترکمانیہ کے صدر مقام اشک آباد میں منعقد ہوا تھا۔ ایشیا کے تمام ملکوں کے نمائندے اس سیمینار میں شریک تھے۔ پاکستان کا وفد آثارِ قدیمہ اور تاریخ کے مشہور عالم ڈاکٹر دانی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر ریاض الاسلام، فیض احمد فیض اور راقم الحروف پر مشتمل تھا۔ ہندوستان کے وفد میں سجاد ظہیر بھی تھے۔ سیمینار صبح دس بجے شروع ہوتا اور چھ بجے شام تک جاری رہتا۔ اُس کے بعد تھیٹر، آپیرا یا ضیافت کا پروگرام بنتا۔

اشک آباد کا نام نو واردوں کے لیے کئی دن تک معمہ بنا رہا۔ کوئی کہتا اس شہر کا نام عشق آباد ہے، کوئی کہتا نہیں عاشق آباد ہے اور کوئی کہتا اشک آباد ہے۔ وہاں لوگوں کی زبان تُرکی ہے اور 'اشک' اور 'عشق' دونوں چوں کہ غیر ترکی الفاظ ہیں اور صوتی اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں اس لیے کوئی شخص شہر کے نام کے بارے میں تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اتفاقاً ایک ضیافت میں وہاں کے پرانے باشندے اور مشہور شاعر عاطف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس شہر سے منسوب ایک پرانی داستان سنائی کہنے لگے، کسی زمانے میں ترکمانیہ پر ایک جادوگر حکومت کرتا تھا۔ اُس کی ایک بیٹی تھی جس کا

نام دریا تھا۔ وہ گُل اوغان نامی ایک کم رُتبہ شخص پر عاشق تھی۔ جادوگر کو جب پتہ چلا کہ دریا کسی معمولی شخص سے محبت کرتی ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور اُس نے بیٹی کو آمو دریا بنا دیا جو بہت دور شمال میں بہتا ہے اور گُل اوغان کو کوہ کوپت داغ میں تبدیل کر دیا جو آمو دریا سے سینکڑوں میل دُور اشک آباد کے قریب واقع ہے۔ اُس نے دریا اور پہاڑ کے درمیان ایک لق ودق ریگستان پھیلا دیا تاکہ عاشق معشوق کبھی ملنے نہ پائیں۔ آمو دریا کی لہریں ریگستان کے کنارے پر سر پٹکتی رہتیں اور پہاڑ اُس کے ہجر میں بارش کے آنسو بہاتا رہتا لیکن بے سُود۔ داستان ختم ہوئی تو کسی نے پوچھا کیا دونوں کبھی نہیں ملے۔ عاطف نے مُسکرا کر جواب دیا، نہیں کبھی نہیں۔ البتہ جب نہر قراقوم آمو دریا سے نکالی گئی اور سینکڑوں میل لمبے ریگستان کو سیراب کرتی اشک آباد سے گزری تو دریا اور گُل اوغان کا ملاپ ہوگیا۔ مگر اس کہانی میں عشق بھی ہے اور اشک بھی لہٰذا نام کی گتھی نہ سلجھنا تھی نہ سلجھی۔ بہرحال یہاں غرض اشک آباد کے نام سے نہیں بلکہ فیض صاحب کی شام سے ہے جو وہاں 'غارت ہوگئی'۔

ہوا یوں کہ مندوبین کی ایک شام خالی تھی لہٰذا چند اُردو داں ساتھیوں نے شہر کی سیر کا فیصلہ کیا اور رہنمائی کے لیے اپنی ترجمان امینہ کو بھی ساتھ لے لیا جو ماسکو اورینٹل انسٹیٹیوٹ میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی تھی۔ وہ کوہ قاف پریوں کے دیس جارجیا (گرجستان) کی رہنے والی تھی اور تھی بھی خوش شکل۔

اشک آباد چھوٹا سا شہر ہے (آبادی ۳ لاکھ) جو ۱۹۴۸ء کے زلزلے کے بعد ازسرِنو تعمیر ہوا۔ چوڑی چوڑی سڑکیں، جن کے دونوں طرف چہار سایہ دار درختوں کی دُہری قطاریں ہر سڑک کے نکڑ پر جگ مگ جگ مگ کرتے پارک جن میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں اور مرد گھوم پھر رہے تھے کیوں کہ اکتوبر میں وہاں خاصی گرمی ہوتی ہے۔ گیارہ بجے کے قریب جب ہم لوگ گھوم پھر کر ہوٹل واپس

لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بنّے بھائی اور فیضؔ صاحب لاؤنج کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھے ہیں۔ فیضؔ صاحب نے امینہ سے تو کچھ نہ کہا البتہ ہم لوگوں سے مخاطب ہوکر بولے تم لوگ آج کہاں غائب تھے۔ عرض کیا ذرا آوارگی کرنے گئے تھے۔ بنّے بھائی بولے، یارو ہم کو بھی ساتھ لے لیا ہوتا۔ اس پر کسی نے کہا جناب آپ لوگ رئیس زادے ٹھہرے، بھلا پیدل چل سکتے تھے۔ ہم لوگوں نے شہر کی تعریف شروع کی تو فیضؔ صاحب یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اچھا بھئی ہم چلے۔ محفل برخواست ہوگئی۔

صبح ناشتے کی میز پر فیضؔ صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بے چین سے نظر آئے کبھی سگریٹ سے سگریٹ جلاتے، کبھی پہلو بدلتے۔ اُن کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکالا، گلا صاف کیا، مُسکرائے اور لجاتے، شرماتے ہوئے آہستہ سے بولے، ہم نے رات تم لوگوں کی ہجو لکھی ہے جو 'اشک آباد کی شام' تھی اور تب پتہ چلا کہ ان دونوں بزرگوں نے امینہ کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر امینہ کو فیضؔ صاحب کی زیرِلب فرمائش سنائی نہ دی۔ لہٰذا وہ ہم لوگوں کے ساتھ چلی گئی اور فیضؔ صاحب اور بنّے بھائی سارے وقت امینہ کا انتظار کرتے رہے۔ شام غارت ہوگئی۔

فیضؔ صاحب کی کم سخنی اُن کے اشعار میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو کم سے کم لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ اُن کی نظموں اور غزلوں میں بھرتی کے شعر یا خواہ مخواہ کی لفاظی مشکل سے ملے گی۔ اُن کو اُردو، فارسی کا شعری مزاج بہت عزیز ہے لیکن وہ نئے تجربوں سے بھی بالکل نہیں گھبراتے۔ 'اشک آباد کی شام' ہی کو لیجیے۔ انہوں نے الفاظ کے انتخاب میں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے اور بالکل جدید طرز کی آزاد نظم لکھی ہے ہم مشرقی اور مغربی موسیقی کے اسرار و رموز سے واقف نہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس کی دُھن جتنی اچھی مغربی موسیقی پر بن سکتی ہے مشرقی پر نہیں۔

مصرعوں کے چھوٹے چھوٹے ارکان، جام، شام، کلام، پرنام، پیغام، انعام، نام آرام جیسے ترنم ریز لفظوں کی آزاد قافیہ بندی۔ 'اشک آباد کی شام' کا منظر جب سُورج نے 'اپنے سنہری جام میں ڈھالی سُرخیٔ اوّلِ شام'، اور من وتُو کی کسی پرانی لذّت شبانہ کی یادیں یا شامِ وعدہ کا حسین خواب اور پھر انتظار کی کٹھن گھڑیاں، یہاں تک ؎

کہ رستہ تکتے تکتے
بُجھ گئی شمعِ جام
اشک آباد کے نیلے اُفق پر
غارت ہوگئی شام

کاش کوئی صاحب دل موسیقار، گاتی گنگناتی اس پُر کیف نظم کی دُھن بنا سکتا جو فیضؔ صاحب کی بہترین آزاد نظموں میں شمار کی جانے کی مستحق ہے۔

تاشقند اور سمرقند کا ہر صاحبِ نظر سیاح قدیم و جدید کا موازنہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ امام بخاری کا مزار، امیر تیمور صاحب قراں کا مقبرہ، اس کی شان و شکوہ کی پُر وقار یادگاریں پھر امیرِ بخارا اور زار شاہی دَور کے ظلم و استبداد کے آثار اور اس کے مقابل میں تعمیرِ نو کی گہما گہمی، خوش حالی، فراوانی، علم و فن کا فروغ، شوقِ آگہی، امن۔

فیضؔ صاحب نے 'تین آوازیں' میں جو سمرقند میں اُن پر وارد ہوئی، انہیں ملے جُلے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

امیر بخارا کے محل کے پھاٹک کے دونوں جانب زمین دوز قید خانے جو کنوئیں ہیں، تاشقند کے عجائب گھر میں رکھے ہوئے اذیت کے اوزار، دیواروں پر سیاسی قیدیوں کی تصویریں، پاؤں میں کمر تک بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، گلے میں آہنی طوق اور اس میں سے گزرتی ہوئی زنجیر جو دوسرے قیدی کے گلے کا طوق ہے۔ پہلی آواز ظالم کی ہے جو پکار رہا ہے کہ ؎

جشن ہے ماتمِ اُمید کا آؤ لوگو!
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو!

اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی کی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
اَبر آئے گا خس و خار کے انبار لیے

موضوع وہی ہے جو اقبالؔ کی نظم کا ہے لیکن فیضؔ صاحب غزل کی روایت کے اتنے دلدادہ ہیں کہ اقبالؔ کی نظم میں سماجی استحصال اور ظلم کی جو تیکھی اور ٹھوس تنقید ملتی ہے اور پڑھتے ہی ظلم کی نوعیت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ جزرسی اور باریک بینی، ظلم سے جو نفرت ہونی چاہیے، اس کا شعور ہونا چاہیے، وہ غائب ہے، شعری حُسن میں کھوجاتا ہے۔ مظلوم کی فریادلینن کی آواز سے کتنی مختلف ہے، البتہ فیضؔ صاحب کی ندائے غیب، اقبالؔ کے فرمانِ خُدا سے کم پُرشکوہ نہیں لیکن زیادہ بامعنی ہے۔ وہ فرشتوں سے دنیا کو بدلوا رہا ہے۔ اس کو انسانوں پر اعتبار نہیں لیکن فیضؔ کی ندائے غیب کو بندوں پر اعتماد ہے ع

ہراک اولی الامر کو صدا دو

فیضؔ صاحب نے ظالم کے جور و ستم اور مظلوموں کے آلام و مصائب کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اتنا مجرد ہے، استعاروں کی کثرت سے شاعرانہ حسنِ بیان میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن نہ ظالم کے ظلم کی ٹھوس شکل اُبھرتی ہے، نہ مظلوم کی ۔

اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
اَبر آئے گا خس و خار کے انبار لیے

اقبالؔ کے وہاں فلسفۂ زیست ہے، فکر کی بلندی ہے، سماجی شعور ہے، ظالم اور مظلوم کی واضح تفریق اور نشان دہی ہے۔ لینن خُدا سے سوال کرتا ہے کہ ۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات

لیکن اُس کی وحدت تو پارہ پارہ ہوچکی ہے۔

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کُچل دیتے ہیں آلات

اور اسی اقتصادی نظام نے انسان سے اس کی انسانیت چھین لی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی مشینوں کا غلام ہوگیا ہے اور آخر میں بالکل واضح لفظوں میں معاشرے کی تمام اقتصادی، اخلاقی اور سماجی، خرابیوں کا ذمّے دار سرمایہ داری نظام کو ٹھہراتے ہوئے فریاد کرتا ہے کہ ۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

سماجی تنقید میں جو کمی رہ گئی ہے اس کو فرشتے پورا کر دیتے ہیں۔

خلقِ خُدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

اس سلسلے کی تیسری نظم تو اب انقلابیوں کا ترانہ بن گئی ہے۔

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تُم کو نظر آئے مٹا دو

البتہ اس نظم میں خدا فرشتوں سے مخاطب ہے اور اُن کو حُکم دیتا ہے۔ اس کے برعکس فیضؔ صاحب کی ندائے غیب کا رُخ حاکم طبقوں کی جانب ہے۔ اُن کو اُن کے عبرت ناک انجام سے خبردار کیا جاتا ہے۔ اُن کو مظلوم کے غیض و غضب سے آگاہ کرتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت مظلوم کی ہے کہ یہ نہیں پتہ چلتا کہ اُس کے ظلم کی نوعیت کیا ہے۔ نہ ظالم کی نشان دہی ہوتی نہ مظلوم کی شکل اُبھرتی ہے۔

رات چھائی تو ہر اک درد کے دھارے چھوٹے
صبح پھوٹی تو ہر اک زخم کے ٹانکے ٹوٹے
دوپہر آئی تو ہر رگ نے لہو برسایا
دِن ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا

جذبات کی فراوانی ہے، حُسنِ بیان کا لُطف ہے لیکن اصل حقیقت کھو گئی ہے۔

'بالِ جبریل' میں اقبال کی تین لفظوں 'لینن'، 'فرشتوں کا گیت' اور 'فرمانِ خُدا' کا موضوع بھی قریب قریب یہی ہے لیکن اقبالؔ کا سماجی شعور بہت واضح ہے۔ اُن کی فکر پورے انسانی معاشرے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ سرمایہ داری نظام کی تمام خصوصیات سے واقف ہیں۔ طبقات کی طرزِ زندگی میں جو تفاوت ہے اُن سے پوشیدہ نہیں، غرض کہ پورے سرمایہ داری نظام پر تنقید ہے۔

فیضؔ اور فلسطین

فلسطین ہزاروں برس سے بیرونی طاقتوں کے تیر ہوس کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ کبھی فراعنہ مصر نے روندا، کبھی اشوریوں نے اس کو تاراج کیا مگر اصل تباہی تو اس وقت آئی جب عبرانی قبیلوں نے مصر سے خروج کے بعد فلسطین پر حملہ کیا۔ اُن کے کھیتوں، انگور، انجیر، زیتون اور کھجور کے باغوں پر قابض ہوگئے۔ پہلی صدی میں یہ خطّہ رومتہ الکبریٰ کے زیر نگیں آیا اور پھر بازنطینی شہنشاہوں کو ورثے میں ملا۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہاں عربوں کے اقتدار کا پرچم لہرایا۔ عربوں کا آفتاب اقبال غروب ہو رہا تھا کہ جنگ صلیبیہ کا شور اُٹھا اور ارضِ فلسطین دو سو سال تک میدانِ کارزار بنی رہی۔ تب عثمانیوں کا دور شروع ہوا اور فلسطین پانچ سو سال تک ترکوں کے تابع رہا۔ ۱۹ویں صدی میں عثمانیوں پر زوال آیا تو مغربی طاقتیں مذہبی حقوق کی آڑ لے کر فلسطین میں مداخلت کرنے لگیں۔ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی غرض سے صیہونی تحریک کو بھی ہوا دی۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو برطانیہ اور فرانس کو عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ فلسطین پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ جنگ میں یہودیوں بالخصوص یورپ اور امریکہ کے دولت مند یہودیوں کی حمایت حاصل کرنے اور مشرقِ وسطیٰ میں اپنے

سامراجی مفادات کے استحکام کے پیشِ نظر برطانوی وزیر خارجہ بالفر نے ۱۹۱۷ء میں سرکاری طور پر یہ اعلان کر دیا کہ یہودی قوم فلسطین کے اندر اپنا وطن بنانے کی مستحق ہے۔ تب انگریزی فوج کی حفاظت میں یہودی فلسطین میں آ کر آباد ہونے لگے۔ (۱۹۱۲ء میں فلسطین میں یہودیوں کی تعداد فقط ۸۳ ہزار تھی جب کہ عربوں کی آبادی سات لاکھ تھی)۔ دوسری جنگِ عظیم تک صیہونیوں نے دولت اور دہشت گردی کے بل پر اپنی پوزیشن اتنی مضبوط کرلی کہ وہ نہ صرف فلسطین کا بٹوارہ کرنے میں کامیاب ہوگئے بلکہ اُن کو امریکہ کی مکمل مالی اور فوجی حمایت بھی حاصل ہوگئی اور اب تک ہے۔ اسرائیل کی ریاست عربوں کے قلب میں قائم ہوگئی مگر عرب ریاستیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں بلکہ انہوں نے جب کبھی لڑنے کی ٹھانی تو شکست کھائی اور اسرائیلی ریاست کی سرحدیں پھیلتی گئیں اور اسی نسبت سے اہلِ فلسطین اپنے آبائی وطن سے ملک بدر ہوتے گئے۔ یہ خانماں برباد فلسطینی عرب آج لاکھوں کی تعداد میں لبنان، شام، اُردن اور دوسرے عرب ملکوں میں کیمپوں اور جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

لیکن وہ اپنے وطن کو بھولے نہیں ہیں بلکہ سوتے جاگتے اُسی کا خواب دیکھتے ہیں اور اس خواب کو حقیقت بنانے کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں۔ اُن کی سرفروشیاں اور قربانیاں حریتِ بشر کی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ تمام آلام و مصائب کے باوجود اُن کے عزم اور حوصلے جوان ہیں اور وہ سر سے کفن باندھے دشمن کے مقابل صف آراء ہیں۔

فیضؔ صاحب نے انہیں مجاہدوں سے محبت اور اخوت کا رشتہ جوڑا اور بیروت میں تین سال تک گولی گولوں کی بارش میں اُن کے رفیق رہے۔

جون ۱۹۶۷ء میں جب عرب اسرائیل جنگ چھڑی تو فیضؔ صاحب کراچی میں تھے۔ اُن کی شاعری کی لَے عموماً دھیمی ہوتی ہے لیکن اس جنگ کے موقعے پر اُنہوں نے جو نظم (سرِ وادیٔ سینا) لکھی۔ اُس میں میدانِ کارزار کی گھن گرج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی جوشیلا عرب شاعر رزم گاہ میں کھڑا رجز پڑھ کر اپنے رفیقوں کو للکار رہا ہے۔

پھر برق فروزاں ہے سروادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغام اجل دعوتِ دیدار حقیقت

انہوں نے اس نظم کے لیے بحر بڑی رواں دواں چُنی اور الفاظ بھی اس کی مناسبت سے بڑے رستخیز منتخب کیے۔ فیضؔ صاحب کو جُز سے کُل کی طرف بڑھنے اور مضطرب قطروں میں دجلہ کا منظر دیکھنے دکھانے کا فن خوب آتا تھا۔ اُن کی نظر میں یہ جنگ فقط عربوں اور اسرائیلیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ دنیا بھر کے مظلوموں محکوموں کی جنگ تھی۔ یہ جنگ ایک ایسی ہمہ گیر تحریک کا تقاضہ کرتی تھی جس کی خشمگیں موجیں ستم کی رسموں کو اور ان رسموں کی تائید کرنے والے مفتیانِ دین کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے۔ فیض صاحب ہماری خوئے بندگی کو بدلنے کے آرزومند تھے چنانچہ اُنہوں نے ہماری رگِ حمیت کو یہ کہہ کر چھیڑا کہ

اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کافرماں کوئی اُترے

فیضؔ صاحب اُن دنوں بڑے مبارزت کے موڈ میں تھے۔ چنانچہ اُس زمانے کی مشہور نظم 'دُعا' کے تیور بھی 'سروادیٔ سینا' سے ملتے جلتے ہیں۔ یوں تو پوری نظم پر ایک طنز آمیز برہمی طاری ہے لیکن آخری بند میں تو شاعر تلملا اُٹھا ہے۔

جن کا دیں پیروئ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

بیروت کے قیام کے دوران فیض صاحب کے جذبات بہت متلاطم رہے۔ ایک

طرف مجاہدین فلسطین کی سرفروشیوں کے مناظر، دوسری طرف وطن کی یاد اور ابنائے وطن پر فوجی آمریت کے ہاتھوں جور و ستم کے جو پہاڑ ٹوٹے اُن کا غم، تنہائی کا شدید احساس، عدم تحفظ اور بے یقینی۔ بیروت سچ مچ جنگ کا میدان بنا ہوا تھا، ہر جانب مورچے لگے ہوئے تھے، گولے برستے تھے، گولیاں چلتی تھیں۔ ہر جانب مورچے لگے ہوئے تھے۔

بیروت کا خوبصورت شہر فیضؔ صاحب کے قیام کے دوران (۱۹۷۸۔۱۹۸۱ء) سچ مچ کا میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر گلی کوچے میں مورچے لگے تھے، عمارتوں پر گولے برستے تھے، دن رات دھماکے ہوتے تھے، گولیاں چلتی تھیں، سڑکوں پر خون کے نالے بہتے تھے،

فیضؔ صاحب فلسطینی مجاہدین کی سرفروشیوں کے عینی شاہد تھے اور ان سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہوکر کئی نظموں میں مجاہدینِ فلسطین کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ فلسطینی شہداء وطن کے لہو کی پکار

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا عَلَم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

فیضؔ صاحب جہادِ فلسطین کے شاعر بن گئے اور جب اسرائیلی درندوں کے ہاتھوں فلسطینی کیمپوں میں عورتوں بچوں کا قتلِ عام شروع ہوا تو فیضؔ صاحب نے فریاد و فغاں کرنے کے بجائے اُسی عزم و حوصلے، اُسی جوش اور ولولے کا ثبوت دیا جو فلسطینیوں کی فطرت بن چکا ہے۔ وہ کربلائے بیروت کا مرثیہ نہیں لکھتے بلکہ قصیدہ لکھتے ہیں، گیت لکھتے ہیں۔

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
جو چہرے لہو کے غازے کی

زینت سے سوا پُر نور ہوئے
اَب اُن کے رنگیں پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اور تاباں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں

فیض صاحب نے مجاہدین فلسطین کے لیے جو ترانہ جون ۱۹۸۳ء میں لکھا، وہ حقیقت میں سبھی محکوم اور مظلوم قوموں کا ترانہ ہے۔

ہم جیتیں گے
حقّا کہ ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

فیض صاحب بیروت میں یوں تو اس وجہ سے مقیم تھے کہ لوٹس، رسالے کا دفتر وہاں تھا لیکن یاسر عرفات اور متعدد فلسطینی ادیبوں اور شاعروں سے اُن کی ذاتی دوستی تھی۔ وہ لوگ فیض صاحب کا بہت خیال رکھتے تھے مگر فیض صاحب کو وطن سے دوری کا جو غم تھا اور وطن کی یاد اُنکو جس طرح تڑپاتی تھی اُس کا علاج فلسطینی دوستوں کے پاس نہ تھا۔

وطن پر جور و ستم کے پہاڑ فوجی آمریت کے ہاتھوں ٹوٹ رہے تھے لیکن فیض صاحب بے بس تھے۔

وطن سے محبت بڑا فطری جذبہ ہے اور بدقسمت ہے وہ شخص جو قدرت کے اس فیض سے محروم ہے، البتہ حُب الوطنی اس قوم کے باشعور افراد سے جو عرصے تک کسی بیرونی طاقت کی غلام رہی ہو اور اَب بھی آزادی کی نعمتوں سے محروم ہو، قربانیوں کی متقاضی ہوتی ہے۔ فیض صاحب نے ادائے فرض میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اُن کے مسلک

عشق میں وطن بقال کی دُکان نہیں جہاں محبت کو سود و زیاں کی ترازو میں تولا جائے۔ وہ تو ماں کا پیار ہے جس کو پیار ہی کے پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے۔ محبوبہ کی محبت ہے جس کی چاہت میں۔

پورے کیے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا، ہر اِک غم کو سنوارا
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

(دو عشق)

فیض صاحب کا راسخ عقیدہ تھا کہ حقائق ہستی کا شعور، تخیل کی بلند پروازیاں اور غم زندگی کا احساس سب مادرِ وطن کی محبت کے صلے ہیں۔

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

لیکن پاکستان کے اربابِ اقتدار کی نظر میں سچا محبِ وطن وہی ہے جس کا شیوہ حکومت کی اطاعت و بندگی ہو اور اگر کوئی شخص اختلاف یا اعتراض کرے تو وہ وطن کا غدار ہے اور سزاوارِ سزا ہے۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

لیکن وطن سے مراد وطن کے دریا، پہاڑ، باغ باغیچے، کھیت کھلیان ہی نہیں بلکہ وطن والے ہیں جن کے وجود سے وطن ایک بامعنی اور بامقصد حقیقت بنتا ہے۔ ابنائے وطن کی

خوشیاں اور اُن کے غم ہیں۔ اُن کا چین و آرام اور اُن کا دُکھ درد ہے اور اگر زندگی کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے تو وطن سے محبت جغرافیہ کا سبق بن جاتی ہے۔ جیل میں وطن سے محبت کا جذبہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لیتا ہے اور وطن والے کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگتے ہیں۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

البتہ قید خانے میں لاکھ مجبوریاں اور لاچاریاں سہی قیدی کے دل کو اس خیال سے سہارا ملتا رہتا ہے کہ چلو اور کچھ نہ سہی یہاں کی مٹی میں وطن کی خوشبو تو ہے۔ زنداں کے روزنوں سے وطن کی ہوائیں تو آتی ہیں۔ فضا میں زنجیروں اور بیڑیوں کی جھنکار ہو یا اسیروں کی چیخ پکار، درد کا لہجہ تو ہم زبانوں کا ہے لیکن وطن سے دُوری میں مٹی سے سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ قلب و نظر کی ان محرومیوں کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کو مجبوراً وطن سے دُور رہنا پڑا ہو۔ مسافرت میں دِل پر کیا گزرتی ہے اور وطن کی یاد کس کس طرح تڑپاتی ہے۔ فیضؔ صاحب کا لندن اور بیروت کا کلام اِسی ہجراں نصیبی کا جیتی تجربہ ہے۔

مرے دِل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں

ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا

وطن سے دُوری کا غم کیا کم تھا کہ فوجی آمریت کے ہاتھوں وطن اور ابنائے وطن پر جور و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مارشل لاء نافذ ہوا۔ آئین منسوخ ہوا، اسمبلیاں ٹوٹیں، وزارتیں برخواست ہوئیں اور مسٹر بھٹو سمیت بہت سے راہ نما گرفتار کر لیے گئے۔

جلا پھر صبر کا خرمن، پھر آہوں کا دھواں اُٹھا
ہوا پھر نذرِ صرصر ہر نشیمن کا ہر اک تنکا
ہوئی پھر صبحِ ماتم آنسوؤں سے بھر گئے دریا
چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا
ہر اِک جانب فضا میں پھر مچا کہرام یارب ہا
بنا پھرتا ہے ہر اک مدّعی پیغام بر تیرا
ہر اک بُت کو صنم خانے میں دعویٰ ہے خُدائی کا
خُدا محفوظ رکھے از خداوندانِ مذہب ہا
چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شب ہا

اُن کا وہم گماں بے وجہ بھی نہیں، اس لیے کہ ؎

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نور ہوگئی ہیں
آئینے چُور ہوگئے ہیں

ساز بج بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بجھ کے سو گئی ہیں

اور پھر گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ سیاسی قیدیوں کو سرِ عام کوڑے لگائے جانے لگے سنتِ منصور عام ہوئی۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کرے
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں
تیرے ایوانوں میں پُرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے

سودا کی غزل۔

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو ہُوا سو ہُوا

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں یہ ہیں اہلِ صدق کی تُربتیں

اک پھول کے مُرجھا جانے پر کیا گلشن میں کُہرام مچا
اک چہرہ کمہلا جانے سے کتنے ہی دِل ناشاد ہُوئے

فیض صاحب کربلائے بیروت سے جب لُٹ لٹا کر وطن واپس آئے تو اُن کے شہرِ نگاراں میں ہُو کا عالم تھا۔ مانا کہ اس سے پہلے لاہور میں دودھ شہد کی نہریں نہیں بہتی تھیں، نہ سُن برستا تھا لیکن اتنا سناٹا تو نہ تھا، اتنی نفسانفسی تو نہ تھی۔

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا
منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

ظلم و ستم کی رسمیں یوں تو ہماری تقدیر بن گئی ہیں لیکن وعدہ فراموشی کی ریت اور اسلام کی اتنی بے حجابانہ تجارت اب سے پہلے اتنی عام نہ تھی۔ اربابِ قلم اور اہلِ علم و دانش کے حلقوں میں ضمیر فروشی کا رجحان ایوب خاں کے دور ہی میں پیدا ہوگیا تھا لیکن نئے دَور میں تو ہوس کی بے شرمیوں نے عزتِ نفس کی نقاب ہی اُتار کر پھینک دی۔

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنف کا قلم ہے

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ وطن سے دُور رہ کر اُن کو وطن اور یارانِ وطن کی یاد اگر شدت سے ستاتی تھی تو اس میں احساسِ تنہائی کو کتنا دخل تھا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ وہ تنہائی سے بہت گھبراتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ہم نفسوں کی صحبت میسّر نہ ہوتی تو وہ ناجنسوں کی صحبت بھی گوارا کر لیتے تھے۔ البتہ جب شعر کا نزول ہوتا تھا اس وقت وہ اکیلے رہنا پسند کرتے تھے۔ تنہائی ہے بھی بڑی ظالم چیز۔ کہتے ہیں کہ سر آرتھر کونل ڈائل (شرلاک ہومز کی جاسوسی کہانیوں کا خالق) کلب یا قہوہ خانے کے ہجوم میں بیٹھ کر کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ جب گھر لوٹے اور چند دنوں کے ہنگامۂ آمدورفت کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو یہی صُورت پیدا ہوئی۔ مسز فیض کام پر چلی جاتی تھیں۔ بچیاں اسکول چلی جاتی تھیں تو فیض صاحب کو گھر کاٹنے کھاتا تھا

اور وہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور جو اِکا دُکا دوست آشنا مِل جاتا اُس کو لے کر کسی ریسٹورنٹ میں خاموش بیٹھ جاتے اور بولنے کا فریضہ دوسروں کے سُپرد کر دیتے۔ کوئی اگر کہتا کہ فیض صاحب آپ تو سارا وقت چُپ بیٹھے رہتے ہیں پھر دوسروں کی موجودگی سے آپ کو کیا حظ ملتا ہے تو کہتے، یار گھر میں اکیلے مجھ کو بڑی وحشت ہوتی ہے۔

بیروت میں تو حالات زیادہ ہی سوہانِ روح تھے۔ فلسطینی احباب کے خلوص و محبت میں کوئی شبہ نہ تھا مگر وہ نہ اُردو سے واقف تھے نہ پنجابی سے۔ دوگمش، وہ سر دھڑ کی بازی لگائے آزادی کی جنگ میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کے پاس مجلس لگانے کی مہلت کہاں تھی۔ اُن کی نظم 'میرے ملنے والے' فیض صاحب کے احساسِ تنہائی کی بڑی بھیانک تصویر ہے۔ صبح، دوپہر، شام، رات، سب پر تنہائی کی سیاہ چادر ؎

وہ درکھلا میرے غمکدے کا
وہ آگئے میرے ملنے والے

شام فرشِ افسردگی بچھانے آتی تھی، رات چاند تاروں کو اپنی آزردگی سنانے آتی تھی۔ صبح یاد کے زخموں پر نشتر چلاتی اور دوپہر شعلوں کے تازیانے برساتی۔ اُن کو دن رات انہیں سے واسطہ رہتا تھا۔ غالبؔ اس فرصت کے لیے تڑپتے تھے تاکہ

بیٹھے رہے تصورِ جاناں کیے ہوئے

مگر ہمارا شاعر اس زبردستی کی فرصتِ تنہائی سے سخت بیزار ہے۔ بس ایک لیلائے وطن ہے جس کی یادوں سے دل کو بہلا لیتا ہے۔

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

یہ وہم و گماں بے وجہ نہ تھے۔ فیض صاحب کے احساسِ تنہائی پر معترض ہونا بہت آسان ہے کیوں کہ ہم نے کربلائے بیروت کی سڑکوں پر لاشوں کا تڑپنا نہیں دیکھا ہے۔ بموں کے دھماکے نہیں سُنے ہیں، عمارتوں کو چشم زدن میں کھنڈر ہوتے اور بیروت کے گلی کوچوں میں آگ کے شعلے بھڑکتے نہیں دیکھے۔ فیض صاحب وہاں جن ہولناک تجربوں سے گزرے، اُن پر بے بسی اور مجبوری کے جو حملے ہوئے، اُن کا ادراک نہیں کر سکتے۔

مانا کہ فیض صاحب تاریخ کے پہلے جلا وطن نہ تھے۔ آخر والٹیئر، بائرن، شیلے، مارکس، اینگلز اور لینن نے برسوں ملک بدری میں بسر کیے اور مرے بھی وطن سے باہر۔ خود ہمارے اپنے کئی انقلابیوں — مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، راجہ مہندر پرتاب سنگھ، دادا فیروز دین منصور، شوکت عثمانی، دادا امیر حیدر وغیرہ — کی زندگی ملک سے باہر دشت نوردی میں گزری مگر ان میں سے کسی کو بھی تنہائی نے نہ ستایا۔ وہ اپنی انقلابی سرگرمیوں میں اتنے مصروف رہے کہ اُن کو تنہائی کا احساس ہی نہیں ہوا۔

لیکن فیض صاحب عمر کی اس منزل میں تھے جب اُن کو جسمانی اور روحانی سہاروں کی سخت ضرورت تھی اور ان کی صحت بھی تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ یوں بھی وہ عالمِ فکر و عمل کے شاعر نہ تھے بلکہ محسوسات کے شاعر تھے اور جب حسّی تجربوں کی طنابیں ٹوٹ جائیں، اور وہ منجمد ہو جائیں تو شاعر کے قلب و نظر کے لیے جنم لیتے ہیں۔

فیض کا آدرش

یہ مقالہ سبطِ حسن صاحب نے فیض احمد فیض کی وفات پر لکھا، جسے ماہنامہ 'اُمنگ' (کراچی) نے شائع کیا۔ مقالے کا ابتدائی حصّہ اس خیال سے حذف کر دیا گیا ہے کہ اس کے بیشتر نکات اس کتاب کے شروع کے اوراق میں آ چکے ہیں۔ (ناشر)

فیض صاحب کا شمار پاکستان میں ٹریڈ یونین تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ کئی برس تک ڈاک اور تار کے ملازمین کی انجمن کے صدر بھی رہے۔ اُن کے گھر پر اور بعض اوقات 'پاکستان ٹائمز' کے دفتر میں مزدور کارکنوں کا ہجوم رہتا تھا اور وہ اخبار میں اس کے مطالبات کی حمایت میں اداریے لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے دو ایک بار بین الاقوامی کانفرنس میں مزدوروں کی نمائندگی بھی کی۔ انہیں کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھا کہ حکومت پاکستان نے آئی۔ ایل۔ او کی بہت سی تجویزوں کو منظور کرلیا۔ اَب تو نہ فیض صاحب رہے نہ وہ تجویزیں۔

آج کل تو وہ حکومتیں بھی امن کی دہائی دیتے نہیں تھکتیں جو دن رات جنگی

تیاریوں میں مصروف رہتی ہیں لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا جب سامراج نواز ملکوں میں امن کا نام لینا جُرم سمجھا جاتا تھا۔ اس قدغن کے باوجود جنگی تیاریوں کو روکنے اور دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رکھنے کی عالم گیر مہم جب شروع ہوئی اور دوسرے ملکوں کی مانند پاکستان میں بھی امن کمیٹی بنی تو فیض صاحب ہی اس کے صدر چُنے گئے۔ وہ امن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور لاہور، اوکاڑہ، گوجرانوالہ، لائل پور، غرض یہ کہ جہاں کہیں امن کمیٹی کا جلسہ ہوتا اُس میں تقریر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ پاکستان کی آزادی، بقا اور ترقی کے لیے امن کتنا ضروری ہے کیوں کہ ان کے بقول 'امن گندم کے کھیت اور سفیدے کے درخت، دُلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصوّر کا مُوقلم'۔ ان کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے کی جنگوں اور آج کل کی جنگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانے زمانے میں جب لوگ تلوار، بندوق سے لڑتے تھے تو تباہی ضرور آتی تھی لیکن اس کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا اور آبادی کا بہت ہی مختصر حصّہ اس سے متاثر ہوتا تھا جس فریق نے میدان جنگ میں شکست کھائی وہ تاج وتخت سے محروم ہوا، ملک کی عنانِ اقتدار فاتح کے قبضے میں آ گئی اور زندگی بدستور پرانے ڈگر پر چلنے لگی لیکن آج امن کے معنی ہیں بنی نوع انسان کی بقا اور ایٹمی جنگ کے معنی ہیں کہ دنیا ملبے کا ڈھیر ہوجائے گی اور انسان، جانور برگ وشجر کسی کا سرے سے وجود ہی باقی نہ رہے۔ جنگی تیاریوں اور اسلحوں کی اس دوڑ میں فائدہ کس کو ہوتا ہے، اسلحے بنانے والی بڑی بڑی کمپنیوں کا اور ان کی حکومتوں کا جو اپنی فوجی طاقت کے بَل پر دوسرے ملکوں پر غلبہ حاصل کرتی ہیں، لہٰذا فیض صاحب کے بقول امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جو امن کا دوست ہوگا وہ لامحالہ آزادی کو بھی عزیز رکھے گا اور جو امن کا دشمن ہوگا وہ آزادی کا بھی دشمن ہوگا۔ ترقی یافتہ ملکوں کا تو ذکر ہی کیا، افسوس اس کا ہے کہ پس ماندہ اور ترقی پذیر ملک بھی اسلحوں کی اس

دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں حالاں کہ یہی رقم اگر فلاحی کاموں پر صرف ہو تو علم کی روشنی سے ہر اندھیرا گھر منور ہو جائے، بے گھروں کو سر چھپانے اور آرام سے رہنے کی سہولتیں میسّر ہوں اور وہ جو دوا علاج کے لیے ترستے ہیں، ان کی محرومیاں دور ہو جائیں۔

فیضؔ صاحب کی شاعری پر غور کرتے وقت ان کے شوقِ وابستگی کے ان پہلوؤں کو نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ ان کے محسوسات کا خمیر انہیں تجربوں سے اٹھا ہے۔

اُردو زبان خوش قسمت ہے کہ اُس نے معاشرتی زندگی کے ہر اہم موڑ پر ایسے صاحبِ کمال پیدا کیے جو اپنے عہد کی پہچان اور روحِ عصر کے ترجمان ثابت ہوئے۔ ولؔی دکنی اور نظیرؔ اکبر آبادی، میر تقی میرؔ اور مرزا سوداؔ، غالبؔ اور سرسیّد احمد خاں، علامہ اقبالؔ اور جوش ملیح آبادی، سب نے یہ تاریخی خدمت انجام دی۔ فیض احمد فیضؔ دورِ حاضر میں دُکھی انسانیت کے ضمیر کی آواز ہیں۔ ایسی آواز جو نغمہ بھی ہے، للکار بھی، جس میں سوز یقیں بھی ہے اور غمِ زمانہ کا درد بھی۔ جہد و انقلاب کی گھن گرج بھی ہے اور حُسن و محبت کی شیریں نوائی بھی۔

فیضؔ صاحب نے شعر کہنا یوں تو کالج کے زمانے ہی میں شروع کر دیا تھا لیکن اُن کے فکر و فن میں انقلابی تبدیلی ۱۹۳۵ء میں آئی۔ انسانی تاریخ کا وہ بڑا پُر آشوب اور ہیجانی دور تھا، عالمی کساد بازاری نے دُنیا کو شدید اقتصادی بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس بحران کی وجہ سے ہندوستان کی نوآبادیاتی معیشت کی حالت اور بھی زبوں تھی، چنانچہ فیضؔ صاحب کے بقول 'کالج کے بڑے بڑے بانکے، تیس مارخاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک چھاننے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اُجڑے ہوئے کِسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہر میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔' ملک کا یہ حال تھا اور یورپ میں فاشزم کا عفریت آگ اور خون کی ہولی

کھیل رہا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی میں برسرِ اقتدار آتے ہی جمہوریت پسند سیاست دانوں اور روشن خیال ادیبوں، مفکّروں، موسیقاروں اور سائنس دانوں، سب پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ جو دار و رسن سے بچے اُن کو بھاگ کر سوویت یونین اور امریکہ میں پناہ لینی پڑی۔ ارنسٹ ٹولر، سٹیفان زوانگ، تھامسؔ مان اور ہنرانک مان، فرائڈ اور آئن اسٹائن، سب ملک بدر ہوئے۔ اسی اثنا میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ اس جارحانہ اقدام پر مجلسِ اقوام میں بہت شور مچا لیکن مسولینی کو برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کی پشت پناہی حاصل تھی لہٰذا مشرق کے ایک پس ماندہ ملک کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا اور مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا۔

ان واقعات نے دنیا بھر کے حریّت پسند ادیبوں کو چونکا دیا اور ان کو محسوس ہونے لگا کہ آزادی اور جمہوریت کے دشمنوں کا اگر جم کر مقابلہ نہ کیا گیا تو پورش لوح و قلم کے امکانات باقی نہ رہیں گے۔ فیض صاحب کے سے حسّاس شاعر کا ان حالات سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی، چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنّفین سے اپنی وابستگی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'جب ہم ۱۹۳۵ء میں امرت سر (ایم۔ اے۔ او کالج) میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ایک ہمارے رفیقِ کار تھے رام پور کے، جن کا نام تھا صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم تھیں ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ایک ہندوستانی ترقی پسند مصنّفین کی ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب ہم چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم ہو جائے۔ کیا تمہیں اس میں کچھ دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور اس میں کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا دَور تھا اور مرضِ عشق بھی لاحق تھا۔ رشید جہاں نے کہا چھوڑو یہ عاشقی کے چکر وغیرہ، یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دنیا کے دُکھ جو ہیں ان کی

نوعیت زیادہ سنگین ہے، یہ تمہارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے اور انہوں نے ہمیں سکھایا کہ اپنا غم جو ہے تو یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ دُنیا بھر کے دُکھ دیکھو اور اپنے لوگوں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے۔ اُن کی پتا کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ اپنے لیے ہی سوچتے رہو گے۔ یہ تو خود غرضی ٹھہری، ہمارا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے۔

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا،

وہ سوچتے ہیں یہ دنیا 'صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم' میں کیوں گرفتار ہے؟ یہاں کوچہ و بازار میں جسموں کی خرید و فروخت کیوں ہوتی ہے؟ اور

یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا!
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

لیکن وہ ترکِ عاشقی پر ہرگز آمادہ نہیں، ہجر و فراق کی گھڑیاں اُن پر اَب بھی گراں گزرتی ہیں۔

ویراں ہے میکدہ، خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دِن بہار کے

شاعر بالآخر اس ذہنی کشمکش کا حل تلاش کر لیتا ہے اور اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ غمِ ذات غمِ زمانہ ہی کا ایک رُخ ہے لہٰذا 'کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں۔' وہ جانتا ہے کہ اس راہ میں 'رن پڑے گا، سر پھوٹیں گے، خون بہے گا' مگر پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن ٹوٹیں گے اور 'خون میں غم بھی بہہ جائیں گے' کیوں کہ جو قوتیں غمِ ذات کا سبب ہیں وہی معاشرے کی گردن کا سنگِ گراں بھی ہیں۔ غمِ ذات نے جب غمِ زمانہ کا امرت پی لیا تو شاعر کا عشق دو آتشہ ہو گیا۔

اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دِل
ہر داغ ہے اس دِل پہ بجز داغِ ندامت

فیض صاحب حُسن و محبت کے شاعر ہیں، اُن کا آدرش دنیا میں حُسن و محبت کی فرماں روائی ہے۔ زندگی کے حسن سے لُطف اندوز ہونے کا جذبہ، غمِ ذات اور غمِ زمانہ سے اُن کا گہرا لگاؤ، اُن کی انسان دوستی اور حُب الوطنی، اُن کی انقلاب پسندی اور آرزومندی سب دردِ عشق کے استعارے ہیں۔ دردِ عشق جو اُن کے طرزِ فکر و احساس کی روح ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے دِل کی خانہ ویرانی کو حسنِ دو عالم کے جلووں سے منور کرتے ہیں۔

مگر دیکھنا یہ ہے کہ فیض صاحب کا تصورِ حُسن و محبت صوفیائے کرام کے روایتی تصور ہی کا چربہ ہے یا اس کے عوامل اور مضمرات سماجی ہیں۔ وہ اَدب برائے ادب کے پیغمبر اور وجودی فلسفی کیرکے گارد کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتے کہ جمالیاتی اور سماجی قدریں جُدا جُدا ہوتی ہیں۔ شاعر کیٹس کے اس مشہور مقولے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ حسین شے مسرت جاودانی ہے، فرماتے ہیں کہ:

'کیٹس کچھ بھی کہے حسن سے صحیح راحت جبھی پہنچ سکتی ہے جب وہ خلاق ہو، یعنی وہ اپنے وجود سے دیکھنے والے کے جذبے، خیال یا عمل میں مزید حُسن کا اضافہ کرے۔ ایک یونانی گل دان جو کسی نظم کا موضوع پیدا نہ کرے، اپنے حسن کے باوجود محض ایک ٹھیکرا ہے مٹی کا۔'

گویا فیض صاحب کی نظر میں حسن کی کسوٹی اُس کی خلاقیت ہے۔ حُسن جمالیاتی ہی نہیں سماجی اور اخلاقی قدر بھی ہے۔

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گِلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

فرماتے ہیں کہ:

'ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو، جس کا حُسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جس سے تزکیۂ نفس ہو، جو ہماری روح کو مترنم کرے، جس کی لَو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جِلا حاصل ہو، صرف حسین ہی نہیں مفید بھی ہے۔'

اس میں چشم ولبِ یار کے حُسن کی قید نہیں بلکہ ہر وہ شے جو انسان کی قوت تخلیق کی مظہر ہو یا انسان کی تخلیقی اور جمالیاتی صلاحیتوں کو اُبھارے حسین کہلانے کی مستحق اور محبت کی متقاضی ہے۔

فیض صاحب کا فلسفۂ محبت ان کے فلسفۂ حسن ہی کی تفسیر ہے۔ ان کو حافظ کا وہ شعر بہت پسند تھا جس میں لسان الغیب نے محبت کو حقیقتِ جاوداں کا رتبہ دیا ہے۔ اس شعر کی تکرار ہم کو فیض صاحب کی نظموں میں بھی ملتی ہے اور اُس تقریر میں بھی جو انہوں نے لینن انعام قبول کرتے وقت کی تھی۔ انہوں نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

'مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخرِ کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است'

اور وہ دُعا کرتے ہیں کہ

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دُعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خُدا یاد نہیں

یہ سوزِ محبت کوئی انسانی کیفیت نہیں بلکہ درد کا وہ رشتہ ہے جو اُفق تا اُفق پھیلا ہوا ہے۔ ان کی انسان دوستی ملک و ملّت، نسل و رنگ کے تعصبات سے پاک ہے، انسانیت کا خون جہاں کہیں ہوتا ہے، فیض صاحب تڑپ اُٹھتے ہیں۔ وہ وطن کی آزادی پر قربان ہوتے ایرانی طلبہ سے پیار کرتے ہیں جن کے 'میٹھے نور اور کڑوی آگ سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا، صبحِ بغاوت کا گلشن'، وہ افریقی حریت پسندوں کا ترانہ گاتے ہیں جنہوں نے 'دھول سے ماتھا اُٹھالیا ہے اور غم کی چھال آنکھوں سے چھیل دی ہے اور بے کسی کے جال کو نوچ کر پھینک دیا ہے' اور امریکی جلاد جب ایتھل اور جولیس روزن برگ کو بے گناہی کے جُرم میں سُولی پر چڑھاتے ہیں تو فیض صاحب ان شہیدانِ وفا کی یاد میں ایسا مرثیہ نما انقلابی رجز لکھتے ہیں جس کی نظیر اُردو کیا دنیا کی شاید ہی کسی زبان میں ملے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

لیکن اس انقلابی شان سے کہ

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حُسن کی

مگر مایوس اور شکستہ دل ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

فیض صاحب نے کہا تھا شاعری مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی ہے اور 'اس جدوجہد میں حسبِ توفیق زندگی کا تقاضہ ہی نہیں فن کا تقاضہ بھی ہے۔' اس تقاضے کو انہوں نے مجاہدینِ فلسطین کی صف میں شامل ہوکر پورا کیا اور گولوں گولیوں کی بارش میں عرب شاعروں کی پرانی روایت کو از سرِ نو زندہ کیا۔ فرماتے ہیں کہ

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت

ب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

فلسطین فیض کا دوسرا وطن تھا جس کا ذکر وہ بڑے دُکھ اور پیار سے کرتے ہیں۔

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے

تیری حُرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے

اور

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارض فلسطیں کا علَم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

رہی اپنے وطن سے محبت، سو فیض صاحب کو کسی سرکار دربار سے سند درکار نہیں۔ انہوں نے لیلائے وطن کو جس جس طرح چاہا ہے، تنہا پسِ زنداں، کبھی رُسوا سرِ بازار۔ اُس پر تو قیس عامری کو بھی رشک آتا۔ اُن کی حُب الوطنی کی سب سے بڑی شہادت اُن کا کلام، اُن کی زندگی ہے اور سب سے بڑی سند عقیدت کے وہ سدا بہار پھول ہیں جو قوم اُن پر نچھاور کر رہی ہے۔ ہم نے دُنیا کو اور کچھ نہ سہی ایک شاعر ضرور دیا جس نے وطن کی لاج رکھ لی۔

فیض صاحب کے فلسفۂ حسن و محبت کا مثبت پہلو آپ نے دیکھ لیا مگر اس کا نہایت اہم ایک منفی پہلو بھی ہے چنانچہ فیض صاحب کی نظر میں ہر وہ شے گھناؤنی، بدصورت اور سزاوارِ نفرین و ملامت ہے جو زندگی کے حُسن کو مجروح کرے، جس سے محبت کا خون ہوتا ہو اور جس کے باعث انسان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا مناسب موقع نہیں ملتا۔ سامراجی طاقتوں کی تخریب کاریاں اور امن سوزیاں، سرمایہ داری نظام کی نفع خوریاں، غلامی جو تحصیلِ ذات اور تزئینِ ذات کے حق میں زہرِ قاتل ہے، انسانی وقار کی بے حُرمتی، استبداد و استحصال نطق و لب کی محرومی، متاعِ لوح و قلم کا زیاں، سب اُس کے نزدیک حُسن و محبت کی قدروں کی نفی کرتے ہیں۔ فیض صاحب کی شاعری فرد اور جمعیت کی ان زبوں حالیوں کے خلاف احتجاج ہے۔

یوں تو پُرانے شاعروں کے شہرِ آشوب بھی احتجاج ہی کی ایک شکل تھے اور کبھی کبھار ان کی غزلوں میں بھی برہمی کا انداز جھلک اٹھتا ہے بلکہ غالبؔ کا سادیدہ ورتو گلشنِ نا آفریدہ کی جانب بھی اشارہ کر دیتا تھا لیکن انیسویں صدی کے آخر تک ہماری شاعری کی فضا پر بیشتر آہ وفغاں کا غلبہ رہا۔ شاعر عہدِ رفتہ کی عظمتوں کو بڑی حسرتوں سے یاد کرتے ہیں مگر اندھی گلی میں ان کو جب آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو وہ لامحالہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ دورِ حاضر کے احتجاجی اَدب کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری نئی احتجاجی شاعری جس کے موجد علامہ اقبالؔ ہیں، حالات زیست کی نقش گری ہی نہیں کرتی بلکہ ان سماجی قوتوں کی نشاندہی بھی کرتی ہے جو ہمارے زوال و انحطاط کا سبب ہیں اور ان حالات کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں۔ جدید احتجاجی شاعری ان حالات کو بدلنے اور فیضؔ صاحب کے بقول 'دست قاتل کو جھٹک دینے' کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ وہ شکست قبول نہیں کرتی کیوں کہ اس کو یقین ہے کہ یہی تاریکیٔ شب، غازۂ رخسارِ سحر اور یہی خزاں آمد بہار کی نوید ہے۔

آتے آتے یونہی پل بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی دم بھر کو خزاں ٹھہری ہے

یہ احتجاجی اَدب جس کی سب سے بڑی خوبی اس کی رجائیت ہے، بیسویں صدی کے سماجی شعور اور سیاسی بیداری کا فنّی اظہار ہے کیوں کہ ملک میں اور اقصائے عالم میں آزادی کی جو تحریکیں اُٹھیں اور جو انقلاب آئے اُن سے ہمارے ادیبوں، شاعروں کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ جنگ جاپان و روس میں زار شاہی کی شکست، سودیشی تحریک اور ترکِ موالات کی تحریکیں، جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں برطانوی کردار، ایران میں مشروطہ کی تحریک، تُرکی میں نوجوان ترکوں کے ہاتھوں سلطان کی برطرفی، پہلی جنگِ عظیم، خلافت اور سول نافرمانی کی ملک گیر تحریک اور پھر انقلابِ روس ایسے اہم واقعات

تھے جو احتجاجی اَدب کا موجب ہی نہیں بنے بلکہ انہوں نے احتجاج کا رُخ بھی متعین کر دیا، احتجاجی ادب میں رفتہ رفتہ انقلابی لہریں بھی اُٹھنے لگیں۔

فیضؔ صاحب دورِ حاضر کے احتجاجی شاعری کے بڑے سچے نمائندے ہیں لیکن ان کے کلام میں احتجاجی رنگ آہستہ آہستہ اُبھرا۔ ان کو 'غریبوں کی حمایت' کا احساس اور 'بازار میں مزدوروں کے گوشت' کی خرید و فروخت کا غم تو ابتدا ہی سے تھا لیکن وہ اس شرمناک صورتِ حال کو 'اجداد کی میراث' تصور کر کے دل کو تسلّی دے لیتے تھے، اُن کو یقین تھا کہ

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

مگر جب 'سطوتِ اسباب' مٹی اور آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو شاعر نے دیکھا کہ

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزُو لے کر
چلے تھے یار کہ مِل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

تب شاعر پر یہ عقدہ کھلا کہ مداوائے غم کے لیے سیاسی آزادی کافی نہیں بلکہ 'نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی' تب آئے گی جب ہم ان ناسُوروں سے نجات حاصل کرلیں گے جو معاشرے کے جسم میں پرورش پا رہے ہیں۔

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں

ہاں مگر تیرے ہوا، تیرے ہوا، تیرے ہوا

یہ تاریخی منصب فیض صاحب کے بقول 'کارخانوں کے بھوکے جیالے' اور بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض و بقاں' اور 'افسردہ جاں کلرک' اور 'کتاب و قلم' کے پاسباں اور دوسرے تمام محبانِ وطن مل جُل کر ادا کر سکتے ہیں۔ فیض صاحب نے اپنی تصنیف 'سرِ وادیٔ سینا' انہیں کے نام معنون کی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ حق و باطل کی اس جنگ میں 'سر پھونیں گے، خون بہے گا'۔

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی!
ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

لیکن نہ کوئی بیرونی امداد آئے گی، نہ کوئی ماورائی طاقت ہماری التجا سُنے گی کیوں کہ ؎

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہی ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے

یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

نمودِ سحر کا یہی یقیں ان کا آدرش تھا۔ ان کو یقین تھا کہ

اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

سُلطانیٔ جمہور کا مژدہ سُناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس وائے چمن تھے، عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ہر معاشرہ اپنے فن کاروں کا، اپنے دانشوروں کا محاکمہ کرتا ہے۔ ان سے پوچھتا ہے کہ تم ہماری تہذیب کی خزانے کے لیے کیا تحفہ لائے ہو، تم نے ہمارے نظامِ فکر و احساس میں، ہمارے ادراک و آگہی میں، ہمارے جمالیاتی ذوق میں کیا اضافے کیے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب تو وقت دے گا جو بڑا بے رحم محتسب ہے، البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ دورِ حاضر کا شاید ہی کوئی شاعر، کوئی ادیب ہو جو فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری سے متاثر نہ ہوا ہو اور شاید ہی کوئی ذی فہم ہو جس کے شعور کی سطح ان کا کلام سُننے کے بعد اونچی نہ ہوئی ہو۔ فیض صاحب نے ہم کو ستم سہنے کا سلیقہ سکھایا، انکار کی جرأت عطا کی، رجز کی زبان دی اور ستم گروں سے نبرد آزمائی میں ہماری ہمت افزائی کی۔ انہوں نے

مشاہدۂ حق کی گفتگو میں حسن کی لطافتوں کا رنگ بھر کر گفتگو کو زیادہ بامعنی دلکش اور پُر اثر بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے بے شمار اشعار ضرب المثل بن گئے۔ انہوں نے اپنی اچھوتی علامتوں، تشبیہوں، اصطلاحوں اور ترکیبوں سے ادب کے خزانے کو مالا مال کر دیا اور وہ ہمارے یقین کو یہ کہہ کر اور مستحکم کر گئے

ہم جیتیں گے
حتّا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اِک دن جیتیں گے

افسوس ہے کہ انقلاب کا یہ نقیب، غرورِ سرد دشمن کا سر نیچا ہوتے نہ دیکھ سکا اور نہ جیت کی صبح اُس کے جیتے جی طلوع ہوئی اور وہ یہ کہتا ہوا ہم سے رُخصت ہو گیا کہ

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم